# مجلس ادارت



# معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر [۲۵، ۴۰]

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر [۹، ۱۴]

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ، شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۶ ماہ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۵ء عدد ۳

فہرست مضامین



## مقالات



## تلخیص و ترجمہ



## معارف کی ڈاک



## وفیات



## ادبیات



ای میل: email: Shibli academy @ rediffmail.com

# شذرات

ہندوستان کو اس کے آئین و دستور میں ایک جمہوری اور سیکولر اسٹیٹ قرار دیا گیا ہے اور یہی اس وسیع و عریض ملک کے لیے مناسب بھی تھا کیوں کہ یہاں مختلف رنگ، نسل اور مذہب کے لوگ آباد ہیں اور یہ مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے، ان متنوع اور مختلف العقاید و مختلف الخیال لوگوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں کی رعایت کر کے اور ان کی مذہبی، تہذیبی اور لسانی پہچان کو باقی رکھ کر ہی ان کو مطمئن رکھا جا سکتا ہے، یہ ان کے اتحاد و ہم آہنگی اور ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے بھی ضروری ہے، سیکولر اسٹیٹ میں اقلیتوں کی روایات کو ختم کرنے، ان کی یادگاروں اور شناخت کو مٹانے اور ان کے تمدن اور کلچر کو نیست و نابود کرنے کی سعی و کوشش سے یک رنگی نہیں انتشار و اختلاف بڑھتا ہے جس سے ملک کی ترقی اور خوش حالی رک جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہی سے ملک کی اقلیتیں اکثریت کی جارحیت، عصبیت اور عداوت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں اور ان پر ایک خاص مذہب کے عقیدہ اور کلچر کو زبردستی تھوپنے کی کوشش ہو رہی ہے، اسی بنا پر اقلیتیں مسلسل کشمکش، بے چینی اور گھٹن میں رہتی ہیں اور ملک میں بھی اسی لیے افرا تفری، انتشار، گراوٹ، بدعنوانی، قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔

---

اتر پردیش ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے، یہاں کی کثیر مسلم اقلیت مذہبی، علمی، تعلیمی، اور تہذیبی حیثیت سے ممتاز ہے، اسی لیے اس کے خلاف تعصب، نفرت اور جارحیت بھی حد انتہا کو پہنچ گئی ہے، اور اس کے ذہنی ارتداد، اس کی فکری کایا پلٹ اور مذہبی تشخص اور زبان اور کلچر کی شناخت مٹانے کا پورا جتن کیا گیا اور اس کا خاص ذریعہ نظام تعلیم کو بنایا گیا، نصابی کتابوں میں ہندو دھرم کے عقاید و توہمات، اس کی میتھالوجی اور دیومالائی تصورات بھر دیئے گئے تاکہ مسلمان بچے اپنے مذہب اور عقیدۂ توحید و رسالت سے برگشتہ اور دین و ایمان سے منحرف ہو جائیں، ظاہر ہے کہ ہندو عقیدے اور دیومالائی قصے کہانیوں پر مبنی یہ نظام تعلیم سیکولرازم کی روح کے منافی اور ملک کے اس دستور و آئین کے خلاف ہے جس نے کسی خاص مذہب کی تعلیم و تبلیغ کا مکلف حکومت کو نہیں بنایا ہے، مگر سرکاری درس گاہوں کی مروج درسی کتابوں کو پڑھنے کے لیے مسلمان بچے بھی مجبور ہیں، جو ان کے اعتقادات اور موحدانہ تصورات سے سراسر متصادم ہیں۔



مسلمانوں کی نئی نسلوں کے ارتداد کی اس سازش کے مقابلے اور تدارک کا مبارک خیال اللہ تعالیٰ نے مجاہد آزادی اور مشہور قومی و ملی رہنما قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے دل میں ڈالا، وہ تحریک خلافت، کانگریس اور دوسری قومی و ملی تنظیموں میں کام کرنے کا پورا تجربہ رکھتے تھے اور عرصے سے نصاب تعلیم کے اس زہر کا تریاق مہیا کرنے کے لیے اپنے ضلع بستی میں دینی تعلیم کے فروغ و اشاعت اور اسلامی مکاتب کے قیام میں مصروف تھے، اور اسے اپنا دینی و ملی فرض سمجھتے تھے، لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اس اہم اور ضروری کام کو انفرادی و علاقائی طور پر انجام دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے طویل المیعاد منصوبہ بندی اور منظم تحریک ناگزیر ہے، چنانچہ قاضی صاحب نے بستی میں، دسمبر ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخوں میں مسلمانوں کے ہر طبقہ و مسلک پر مشتمل افراد کا ایک دو روزہ اجتماع کیا اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کا قیام عمل میں آیا، جس کی صدارت کے لیے بجا طور پر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا انتخاب ہوا اور قاضی صاحب کو جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا، مولانا محمود الحسن بستی، جناب ظفر احمد صدیقی وکیل سیتاپور، ریاض الدین صاحب پرنسپل مجیدیہ انٹر کالج الہ آباد اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھنو جیسے ملت کے مخلصین اور دردمندوں نے اس کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اس وقت مولانا سید محمد رابع ندوی اس کے صدر اور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی جنرل سکریٹری ہیں۔

---

اتر پردیش دینی تعلیمی کونسل کی توجہ اور کوشش سے جو معیاری آزاد خود کفیل مکاتب قایم ہوئے ہیں وہ مسلمان بچوں کے ایمان و عقیدے کی حفاظت و سلامتی اور ان کے دینی و ملی تشخص و شناخت کے ضامن ہیں، ان میں حکومت کے منظور شدہ کریکولم میں شامل تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں، مزید برآں اردو اور دینیات کا خصوصی نصاب بھی شامل ہے، ہندی اور انگریزی چھوڑ کر سب مضامین اردو میڈیم سے پڑھائے جاتے ہیں، کونسل کی معیاری متبادل نصابی کتابیں پڑھ کر بچے پانچواں درجہ پاس کر کے چاہیں تو عصری درس گاہوں میں داخلے لیں اور چاہیں تو مدارس میں دینی تعلیم حاصل کریں، اس نے اقلیتوں کے عصری تعلیمی اداروں کے مسایل پر غور و فکر اور ان کی دشواریوں اور مشکلات کے حل کے لیے ان کی ایسوسی ایشن بھی قایم کی ہے، کونسل

کی اصلاح نصاب کمیٹی سرکاری درسی کتابوں کا جائزہ لے کر ان میں شامل زہریلے، نفرت انگیز، عصبیت وعداوت اور غلط بیانیوں سے پُر مواد اور قابل اعتراض غیر جمہوری وغیر دستوری اسباق و اقتباسات کی نشان دہی کرتی ہے اور ان کی اصلاح کی طرف ذمہ داروں کو متوجہ کرتی ہے اور اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو اس سے واقف کراتی ہے کہ ان کی بربادیوں کے مشورے کہاں کہاں ہورہے ہیں، اس طرح کے دو جائزے پہلے شایع ہوئے تھے، اور اب اس سال یہ نیا جائزہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے، جو ہمارے پیش نظر ہے، اسے دیکھ کر یہ باتیں بے اختیار نوک قلم پر آگئیں، خوشی ہے کہ اتر پردیش کے محکمہ تعلیم نے دینی تعلیمی کونسل کے وفد کے اکثر مطالبات اور سفارشات مان لیے ہیں، اس وقت کونسل کی ضرورت واہمیت پہلے سے زیادہ ہے، بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جنون اور مسلمانوں کے تعلیمی مسایل کی پیچیدگی کی وجہ سے اس محاذ پر چوکنا رہنا نہایت ضروری ہے، دینی تعلیمی کونسل کے پاس افراد کی کمی اور مالی وسایل کی قلت ہے، ہر فرقہ ومسلک کے مسلمانوں کو اس کا پورا تعاون کرنا چاہیے۔

---

اب ملک کی فضا بدلی ہے، مرکز اور اتر پردیش میں سیکولر حکومتیں قایم ہیں، لیکن حکومت کا عملہ، محکمے اور دفاتر فرقہ پرستوں ہی کے نرغے میں ہیں، بی، جے، پی کے زیر اقتدار ریاستیں مرکزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی اور اس کے تیار کردہ نصاب کے بجائے سنگھ پریوار کی تعلیمی پالیسی اور درسی کتابوں ہی کو اپنی ریاستوں میں نافذ کرنے پر اڑی ہوئی ہیں، گجرات ایجوکیشن بورڈ آف ایجوکیشن کی شایع کردہ نویں کلاس کی سوشل سائنس کی کتاب میں حقایق توڑ مروڑ کر پیش کیے گئے ہیں، اس کا کوئی صفحہ بھی غلطیوں اور مبتذل زبان وبیان سے خالی نہیں، اقلیتوں اور عورتوں کا ذکر اس میں بہت توہین آمیز انداز میں ہے، سیاسی پارٹیوں یہاں تک کہ کانگریس نے بھی اس کے متعلق خاموشی اختیار کر رکھی ہے، ممتاز و ماہر مورخین اور بعض سرگرم تنظیموں نے احتجاج کیا مگر وہ بے اثر رہا، مدھیہ پردیش کے اسکولی نصاب میں کنول کی تصاویر شایع کی گئی ہیں جو بی، جے، پی کا انتخابی نشان ہے، کانگریس کی شکایت پر الکشن کمیشن نے مدھیہ پردیش کی حکومت کو انہیں ہٹانے کی ہدایت کرتے ہوئے ان افسروں کے خلاف کارروائی کرنے کو کہا ہے جو ان تصاویر کو نصاب میں شامل کرنے کے ذمہ دار ہیں، راجستھان میں بھی ایمان سوز بجلیاں گر رہی ہیں جو اقلیتوں کے لیے سوہان روح ہیں مگر ہائے ان کی بے بسی۔



# مقالات

## مولانا شبلیؒ کی دینی منزلت

از:- پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی☆

مولانا شبلی نعمانی (۱۲۷۴/۱۸۵۷-۱۳۳۲/۱۹۱۴) عظیم ترین علمائے اسلام میں سے ہیں، نہ صرف اپنے دور کے بلکہ اپنے بعد کے ادوار کے بھی، بہ طور ایک عالم دین وہ ایک لازوال مقام ومرتبت اور رفعت کے مالک ہیں، اپنے علم وفضل، درس وتدریس اور دینی کمالات کے لیے ان کا شمار جلیل القدر علمائے ہند میں ہوتا تھا، وفات کے بعد وہ اپنی کتابوں میں زندہ و تابندہ تر ہیں اور ان کی دینی حیثیت اور اسلامی منزلت محفوظ ومضبوط تر ہے، انہوں نے زندہ جاوید اسلامی ادب اپنی میراث میں چھوڑا ہے اور جب تک اردو اور اسلامیات باقی ہیں مولانا شبلی کی دینی وجاہت بھی قایم رہے گی۔

علمی دنیا کی ایک حیرت ناک اور المناک بھی روایت رہی ہے کہ علمی شخصیات شہرت کسی خاص فن میں پاتی ہیں، بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ان کا امتیازی فن اور خصوصی علم نہ تھا، کبھی ان کی تالیفات ان پر کسی خاص علم وتخصص کا ٹھپہ لگا دیتی ہیں اور یہ بھی بوالعجبی نظر آئی کہ زمانے اور ابنائے وقت نے ان کو کسی خاص نام سے شہرت دے دی اور ان کا مقام امتیاز چھپا دیا، امام ابن اسحاق (محمد بن اسحاق-۸۵/۷۰۴-۱۵۰/۷۶۷) امیر المومنین فی الحدیث کی منزلت سے گرا کر محض سیرت نگار بنائے گئے امام طبری (محمد بن جریر-۲۲۴-۲۲۵/۸۳۹-۳۱۰/۹۲۳) حدیث وفقہ کے امام کے بجائے مفسر ومورخ زیادہ مشہور ہوئے، امام ابن کثیر (اسمٰعیل بن عمر-۷۰۱/۱۳۰۱-

---

☆ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

۱۳۷۳/۷۷ء) بھی اصلاً محدث تھے مگر شہرت بہ طور مورخ و مفسر پائی، انہیں نابغۂ روزگار شخصیات کی مانند مولانا شبلی بھی ہیں، ان کو محض سوانح نگار و سیرت نویس بنا کر ان کا دینی مقام بھلا دیا گیا۔

مولانا شبلی نعمانی کا ایک اور عصری المیہ "شبلی شکنی" کی ایک مسلسل، شعوری تحریک ہے جو ان کی حیات سے جاری ہے، وہ واحد عالم برصغیر ہیں جن کی مخالفت ان کی زندگی میں ان کی تصنیف سے پہلے ہوئی اور آج تک مخالفین و معاندین اس سے فارغ نہیں، معاصرانہ چشمک کے علاوہ مسلکی، اداری اور گروہی عناد بھی اس کے ارکان اربعہ ہیں، ان کی دینی منزلت کو مسمار کرنے کے لیے ان کو متکلم، سوانح نگار، مورخ حتی کی معتزلی بھی کہا گیا، اسی کا شاخسانہ ہے کہ ان کو مولانا کے بجائے علامہ قرار دیا گیا، یہ سب ان کے عالم دین ہونے کے فضل و مقام سے محروم کرنے کی سازش کی کڑیاں ہیں اور اس مقالہ کا جوہری زور اسی دینی منزلت کو اجاگر کرنے پر مرتکز ہے (عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ۷۴/۸ اومابعد العلامۃ شبلی ...... المعروف بمولانا شبلی النعمانی، الشیخ الفاضل ...... وکان معتزلیا فی الاصول ...... شیخ محمد اکرام، موج کوثر، تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۷ء، ۲۲۲ - ۲۲۳ " اپنی علم الکلام کی کتابوں میں تو وہ علانیہ ایک معتزلی نظر آتے ہیں" ...... " مذہبی معاملات میں دیوبند کے علما شبلی سے اتنے ہی ناخوش ہیں جتنے سرسید سے" ...... خود شبلی ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں دیوبند کے آرگن "القاسم" کے متعلق لکھتے ہیں: "القاسم کے نزدیک ہم لوگ کافر، کم از کم مضل و گمراہ ہیں"، چنانچہ شبلی کی وفات سے چند ماہ پہلے علمائے دہلی نے ان کی تکفیر کا باقاعدہ فتویٰ دیا" بحوالہ حیات شبلی ص ۲۳، مولانا یا کسی بھی شخص پر معتزلی ہونے کا الزام بعض مسائل میں ان سے اتفاق کرنے یا محض اپنے خیال و قیاس کی بنا پر لگا دیا جاتا ہے، مولانا مرحوم نے معتزلہ پر جابجا نقد شدید کیا ہے جیسے ان کے انکار روایت احاد کو انکار بداہت قرار دیا ہے (۸۱/۱: مقدمہ سیرت) مگر ان تنقیدات شبلی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے)۔

ہمارے برصغیر میں بالعموم اور پورے عالم اسلام میں بھی، عالم دین یا طبقہ علما میں ہونے کی ایک خاص علمی شرط ہے اور وہ ہے تین بنیادی علوم اسلام و فنون شریعت، قرآن و تفسیر، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی، میں مہارت و تبحر، تینوں میں تبحر و اختصاص حاصل ہو تو کیا کہنا مگر ان



میں سے کسی ایک میں خصوصی مقام و مرتبہ ہونا ضروری ہے، بالخصوص حدیث و فقہ میں برصغیر پاک و ہند میں اب اور شاید ہر زمانے میں فقہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی، حدیث میں اختصاص بھی دوسرے درجہ پر رہا اور اصل ماخذ دین، قرآن کریم اور تفسیر کو بوجوہ تیسرے درجہ پر اتار اگیا، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہی علوم ثلاثہ اصل شرط ہیں۔

حضرت مولانا شبلی کی بنیادی تعلیم و تربیت وہی ہوئی تھی جو ان کے تمام معاصر علمائے ہند کی روایتی طور سے ہوتی تھی، ان کے بزرگوں نے ان کو ایک عالم دین ہی بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ خود اپنی تعلیم و مزاج و پرداخت کے اعتبار سے پکے مولوی بنے تھے، مولانا سید عبدالحی حسنی جیسے ناقدین کرام نے بھی شبلی کی تحصیل فقہ و حدیث کا ذکر کیا ہے کہ رام پور جاکر شیخ ارشاد حسین عمری رام پوری سے انہوں نے فقہ و اصول کی تعلیم پائی تھی اور سہارن پور جاکر شیخ احمد علی بن لطف اللہ ماتریدی سہارن پوری سے حدیث پڑھی تھی، ان کو اس زمانے میں "متصلب در مذہب" قرار دیا ہے، اگرچہ قرآن و تفسیر کی تحصیل کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر، ۱۷۴/۸: "...... ثم سافر الی رامپور و اخذ الفقہ والاصول عن الشیخ ارشاد حسین العمری الرامپوری، ثم ذھب الی لاھور ...... ثم دخل سھارن پور و قرأ الحدیث علی الشیخ احمد علی بن لطف اللہ الماتریدی السھارنپوری ...... وکان متصلبا فی المذھب فی ذلک الزمان ......"۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے شبلی نعمانی کے نعمانی تصلب کے بجائے ان کے فقہی رسالہ "اسکات المعتدی" کو اہل حدیث سے مباحثہ کی ایک تصنیف قرار دیا ہے" ...... صرف برھۃ من الدھر فی المباحثۃ باھل الحدیث وصنف اسکات المعتدی، رسالۃ فی قرأۃ الفاتحۃ خلف الامام"۔

ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی کی عقیدت بھری اور تحقیقی سوانح حیات شبلی کے عنوان سے لکھی اور اس میں اپنے استاذ گرامی کی تعلیم و تربیت اور درس و حصول علم کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، ان تحقیقی بیانات سے مولانا شبلی نعمانی کے دینی علوم ثلاثہ میں مہارت و تبحر اور پکی دسترس و قدرت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے دینی امتیاز و مرتبہ کا پتہ چلتا

ہے، سہ گانہ علوم دینیہ میں مولانا شبلی کے اختصاص و تبحر کا ذکر فن بہ فن کیا جارہا ہے تاکہ ان کی دینی بنیادوں کی استواری کی شہادت ملے :

۱- فقہ و اصول : ''...... مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی ، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی ،...... علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر ، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے ، مولانا ارشاد نہایت متشدد حنفی تھے ، (حیات شبلی ، ص ۷۹-۸۰) ...... دیوبند میں فرایض کا علم سیکھا یا فرایض کا رسالہ یہیں پڑھا ، مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں پڑھنے کو ملی تھیں ...... (ص ۸۰) مولانا ارشاد حسین نے ۸؍ جمادی الاخری ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی''۔ (حاشیہ نمبر ۱، ص ۷۹)

۲- حدیث و اصول حدیث : '' مولانا احمد علی سہارن پوری (م ۷؍ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ اکتوبر ۱۸۹۷ء) اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے ...... اس زمانہ میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا ...... اسی اصول پر مولانا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پاکر حدیث کی طرف توجہ فرمائی ...... انہوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا ، مولانا اپنے شیخ حدیث کو اکثر ہمارے مولانا کہا کرتے تھے ...... (۸۴-۸۵) ، سید صاحب نے مولانا سہارن پوری کی جو سند حدیث نقل کی ہے وہ شیخ محمد اسحاق کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچتی ہے ۔ (۸۶-۸۷)

۳- قرآن و تفسیر : '' مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی ، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے ، مولانا شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا ...... دارالعلوم ندوہ میں آکر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا ، قرآن پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیے (ص ۸۳-۸۴) ، مولانا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء میں وفات پائی'' ۔ (۸۴)



بایں ہمہ مولانا شبلی کی تصنیفی سرگرمیوں اور فنی جولانیوں نے بہ ظاہر دینی علوم کے سرچشموں سے دور کردیا ، ان کے تمام تبحر و دینی مہارت کے باوصف اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ملامت لائم اور دشنام دشمنان سے زیادہ ان کی اپنی نگارشات اور تحریروں نے ان کو ''عالم دین'' نہیں رہنے دیا ، وہ فرشتوں کے لکھے کے بجائے اپنے لکھے پر پکڑے گئے لیکن ان کے اندر جو بنیادی عالم دین اور مولوی چھپا بیٹھا تھا وہ ان کی دوسری فنی تحریروں کے اوراق و صفحات میں ہویدا ہوجاتا ہے ، سیرۃ النبی ، الفاروق ، سیرۃ النعمان ، الغزالی اور دوسری تصانیف میں شبلی نعمانی کے دینی سہ گانہ علوم پر دسترس کے آثار موجود ہیں اور ان کتابوں میں بھی ان کی ''دینیت'' اور دینی منزلت کے شواہد پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر ان کو معتزلی اور کافر قرار دیا گیا ، قدیم تعلیم اور جدید علوم کی کشمکش و کشاکش میں وہ مولانا ہی سمجھے اور قرار دیے گئے ، ذیل میں ان کے دینی علوم پر دسترس کا ایک طایرانہ جایزہ لیا جاتا ہے کہ وہی ایک مقالے کی بساط میں آتا ہے ، تفصیلی بحث تو ایک دفتر معنی کی طالب ہے ۔

**قرآن مجید و تفسیر**

قرآن مجید اور تفسیر میں مولانا شبلی کا خاص ذوق تھا اور اس کی آبیاری مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے درس خاص نے کی تھی ، بالعموم مولانا موصوف سے شبلی مرحوم کی ادب و بلاغت کی تحصیل کا ذکر کیا جاتا ہے ، وہ بھی ہوئی تھی مگر سید صاحب کے مطابق مولانا شبلی کو قرآن مجید کے معجزانہ فصاحت و بلاغت اور ادبی نکتہ سنجیوں کے علاوہ خاص قرآنی ذوق ، ترجمے کا مذاق اور تفسیر کا ذائقہ ملا تھا ، مولانا شبلی نے اپنے ابتدائی دور میں اپنے ماموں زاد بھائی حمید الدین کو جو بعد میں مولانا فراہی کے نام نامی سے مشہور نظریہ نظم قرآن کے مجدد مفکر اور ایک خاص مکتب فکر قرآنی کے بانی بنے ، قرآن و تفسیر بھی پڑھاتے تھے اور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا فراہی کا ذوق مولانا شبلی کی دین تھی ۔ (حیات شبلی ، ۹۷ وغیرہ ، مکاتیب شبلی )

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں مولانا شبلی اگرچہ فارسی ، عربی کی تدریس کے لیے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تھے تاہم کچھ مدت کے بعد انہوں نے قرآن و تفسیر کا بھی درس باقاعدہ دیا جو الگ سے ایک فی سبیل اللہ خدمت تھی ، مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ '' ...... اور عربی کے پروفیسر ہوگئے اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے ، کالج کے علاوہ شہر کے بعض

عربی کے طلبہ بھی کبھی کبھی آ کر پڑھتے تھے'' (۱۲۳)، سوانح نگار شبلی کا مزید بیان ہے کہ '' مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اس درس کو ایسا دل چسپ بنا دیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا''، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ '' میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے''، سید سجاد حیدر صاحب کہتے تھے کہ '' مولانا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصول بلاغت اور صنائع و بدائع کو بتاتے تھے اور ان صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے''۔ (حیات شبلی، ص ۱۴۹، اس کے بعد سیرت پر مختصر عربی رسالہ بدء الاسلام کی تالیف اور میلاد کی محفلوں کے انعقاد کا ذکر کیا ہے)

**رسائل و مضامین قرآنی**

درس و تدریس کے علاوہ مولانا شبلی نے مختلف اوقات میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر سے متعلق متعدد مضامین لکھے جن کو مقالات شبلی میں جمع کر دیا گیا ہے، ان کے عناوین و موضوعات حسب ذیل ہیں: ۱- تاریخ ترتیب قرآن ۲- علوم القرآن ۳- اعجاز القرآن ۴- قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟ ۵- قضا و قدر اور قرآن مجید ۶- یورپ اور قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعوی (جلد اول، ۱-۷۵) ۷- نظم القرآن و جمہرۃ البلاغہ (دوم، ۱۳-۲۸) ۸- تفسیر کبیر امام رازی (چہارم، ۴۲-۴۸)۔

ان رسائل یا مضامین کے علاوہ مولانا شبلی کی کوئی مستقل کتاب قرآن مجید پر نہیں ہے، ان کے منصوبہ سیرت میں تیسری جلد '' قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث'' کرتی لیکن وہ نہ صرف لکھی نہ جا سکی بلکہ جامع گرامی کی ترتیب نو میں گم ہو گئی۔ (مقدمہ سیرت، ۱/۱۰۲)

بہرحال مولانا شبلی نے سیرت النبی کے مختلف ابواب و مباحث میں علوم قرآنی سے اپنی گہری آگاہی کے ثبوت چھوڑے ہیں، ان کی حیثیت محض اشارات و نکات کی ہے لیکن وہ علمی، تحقیقی اور ذوقی دقایق کا درجہ رکھتے ہیں جن کی تراوش صرف ایک صاحب علم و ذوق کے قلم سے ہی ہو سکتی ہے، ان میں سے متعدد کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کا ذوق و تبحر قرآنی کتنا بلند اور جامع تھا اور سید سلیمان ندوی کا تبصرہ بالکل غلط نہیں ہے کہ وہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج مفسر و معلم



قرآنی بھی تھے، اپنی علمی کتابوں میں جس طرح انہوں نے قرآن مجید سے شہادتیں لی ہیں وہ ان کے دینی علوم کی مہارت کی گواہی تو دیتی ہی ہیں ان کی جامعیت و بصیرت بھی اجاگر کرتی ہیں۔

ان شواہد و شہادات کے بعد مولانا شبلی کے قرآنی افکار اور تشریحی نکات اور تفسیری دقایق کا محض ایک جائزہ ہی اس مقالے میں پیش کیا جا سکتا ہے، بحث کا آغاز ان کے مضامین قرآنی کے تجزیے سے کیا جاتا ہے، پھر سیرت النبی وغیرہ تصانیف شبلی میں ان کے قرآنی نکات کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، اس مختصر جائزے میں صرف عمدہ نکات جو قرآنی علوم کے تبحر کو روشن کرتے ہیں پیش کیے جائیں گے، تفصیل مباحث سے طول کلام ہوگا، جس سے احتراز بہتر ہے۔

پہلے مقالہ یا مضمون میں مولانا شبلی نے قرآن مجید کے نزول اور جمع و ترتیب سے مختصر بحث کی ہے جو اس کا ذیلی عنوان بھی ہے، چالیس سال کی عمر شریف میں غار حرا کی تنہائی میں فرشتہ یزدانی کے ذریعہ تنزیل اولین آیات سورہ اقرا کو بیان کیا ہے جس میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت ورقہ بن نوفل کی تسلی و تصدیق بھی ہے جو بخاری کے حوالہ سے ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی حدیث بنیادی ماخذ ہے، حاشیہ میں مولانا نے حدیث عائشہؓ کو مرسل قرار دے کر مراسیل صحابہ کے معتبر کی بات بھی کہی ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی صحابی سے ہی یہ حدیث لی ہوگی، فترہ کی مدت تین برس عام روایات کے زیر اثر بتائی ہے جب کہ وہ تحقیقی طور سے چالیس دن تھی، پھر فترہ وحی کے خاتمہ پر سورہ مدثر کی آیات کے نزول کے بعد ضرورت کے تحت آیات کے نزول، ان کی تعداد، کاتب صحابہ سے مختلف چیزوں پر قرآن کی کتابت اور ان اشیا کا ذکر کیا ہے، سورتوں کے اندر باہمی ترتیب آیات اور پھر سورتوں کے درمیان ترتیب کو مفصل بحث سے توقیفی ثابت کیا ہے اور ان روایات کا جواب فراہم کیا ہے جن سے عہد نبوی میں تدوین و کتابت اور ترتیب کے بارے میں شبہہ پیدا ہوتا ہے، قرآنی آیات کریمہ کے علاوہ ترمذی، نسائی، ابو داؤد، بخاری، مستدرک حاکم، مسلم، تفسیر کبیر، حافظ ابن حجر کی شرح بخاری وغیرہ سے اس کو مدلل کیا ہے پھر عہد صدیقی میں تدوین قرآنی کی بحث کی ہے، تدوین عثمانی کے ضمن میں ان کی اختلاف مصاحف اور قرأت پر عمدہ بحث ہے، مختلف مصاحف صحابہ کے علاوہ شیعہ نقطہ نظر حذف قرآن پر نقد کیا ہے اور اس سے زیادہ نقد ان محدثین، طبرانی، بیہقی وغیرہ پر ہے جو دعائے قنوت کو قرآن کی سورتوں

میں داخل کرتے ہیں، اس بحث میں مولانا نے ان محدثین کرام کی محدثانہ حیثیت سے بھی تعرض کیا ہے جو نقد حدیث کا ایک عمدہ مضمون ہے، اس میں رجال کی ثقاہت اور ضعف پر بھی بحث ہے، انزل القرآن علی سبعۃ احرف کا نظریہ بھی زیر بحث آیا ہے اور سورہ فرقان کی قرأت کے اختلافات بھی اجاگر کیے گئے ہیں، غالباً فتح الباری کے حوالے سے صحف صدیقی پر ان کی بحث اور حضرت مروان بن حکم اموی پر ان کی تنقید اور حضرت عثمان کو محض صحف صدیقی کا ناقل قرار دیا ہے جو محل نظر ہے۔

دوسرے مضمون علوم القرآن میں تفسیری سرمایہ کے علاوہ دوسری تصانیف کا جائزہ لیا ہے، تمام تفاسیر کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱-فقہی ۲-ادبی ۳-تاریخی ۴-نحوی ۵-لغوی ۶-کلامی، پھر اعجاز القرآن کی کتب کا مختصر جائزہ ہے، باقلانی کی کتاب پر شبلی کی تنقید اور عبدالقاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کی تعریف خاصے کی چیزیں ہیں، صنائع و بدائع (مجاز، ضرب الامثال، فواتح، قسم وغیرہ) کے علاوہ قصص اور حقائق اشیا کے متعلق سرمایہ کو باعث شرم قرار دیا ہے اور ابن خلدون کا نقد نقل کیا ہے، اسرائیلیات کی شمولیت پر مولانا شبلی کی تنقید بڑی عالمانہ ہے اور امہات کتب اور ایمہ فن کے حوالوں سے مزین ہے۔

اعجاز قرآن پر تیسرا مضمون قرآنی ہے، اعجاز پر اتفاق امت کے بعد وصف اعجاز کے اختلاف کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی فہم پر مبنی اور آیات اعجاز سے مستعار وجوہ اعجاز کا تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ قرآن سے فصاحت و بلاغت کا ”مدار اعجاز“ ثابت نہیں ہوتا لہذا اصل وجہ اعجاز ہدایت وحکمت کا وصف قرآنی ہے جس کا ذکر بہت سی آیات کریمہ میں ہے، مختصر ہونے کے باوجود ایک نیا نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔

اقسام القرآن پر تقریباً تمام مفسرین کرام نے بحث کی ہے اور متعدد نے تو خاص کتابیں تصنیف کی ہے، دوسرے مفسرین پر ایک مختصر تبصرہ کرکے ”مولوی حمید الدین صاحب“ کی تحقیق وتشریح کو پیش کیا ہے، قسم کا استعمال، عرب روایت، مقصود وغیرہ سے بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ قسم قرآن دراصل قدرت الٰہی پر شہادت دیتی ہے، قسم، حلف، یمین کے فرق وغیرہ کو بتا کر دلائل وآیات سے مدلل کیا ہے۔



قضا وقدر اور قرآن مجید پر بحث کا آغاز ایک خطرناک دعوے سے شروع کیا ہے کہ یہ ان مسائل میں سے ہے ”جن کی گرہ فلسفہ اور مذہب دونوں میں سے ایک بھی نہ کھول سکا“ پہلے مقدمات پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کے فرقوں قدریہ وجبریہ کے علاوہ یورپی فلسفہ کے افکار و تشریحات بیان کی ہیں، تحقیق کی ہے کہ امام رازی کا نظریہ کہ ”خدا بھی فاعل مختار ہے اور انسان بھی“، بوسویہ کے مذہب کی اساس ہے، اختیار انسانی اور اختیار الٰہی سے اور ان سے زیادہ ان کے فرق وامتیاز سے متعلق اشعری، رازی اور جبریہ وقدریہ وغیرہ کے افکار کو آیات قرآنی کی صحیح فہم نہ رکھنے پر مبنی قرار دیا ہے، پھر آیات قرآنی، محدث ابن قیم، فطرت انسانی کی تخلیق ربانی اور ان سے متعلق فکر غزالی وغیرہ سے بحث کی ہے، اس بحث شبلی میں بنیادی فکر حافظ ابن قیم کی کتاب شفاء العلیل سے ماخوذ ہے لیکن تجزیہ و پیش کش کا سہرا شبلی کے سر بندھتا ہے، حاصل بحث یہ ہے کہ عالم سلسلہ اسباب پر قایم ہے، سبب کے ساتھ مسبب کا وجود ضروری ہے، سلسلہ اسباب خدا نے پیدا کیا ہے، انسان کا ارادہ اور خواہش من جملہ اسباب کا ہے اس بنا پر انسان اپنے افعال کا سبب اور خالق ہے لیکن علۃ العلل ہونے کے لحاظ سے ان افعال کا خالق بھی خدا ہے، انسان جو افعال کرتا ہے اپنی فطرت کے لحاظ سے کرتا ہے اور ان افعال کے جو لازمی نتایج ہیں، وہ اسی سلسلہ اسباب کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

قرآن مجید کے صحیح نہ ہونے کے یورپ کے دعوے کو مولانا شبلی نے اپنے دلایل سے غلط ثابت کر دیا ہے، اصل بحث یا اعتراض ڈاکٹر منگانا کی تحقیق ہے جو لندن ٹائمز کے ایک آرٹیکل مورخہ ۲۵/اپریل ۱۹۱۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی، مولانا مرحوم نے قرآن کریم کی تدوین اور تحریر وکتابت سے بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا واحد متن ہے جس پر اتفاق ہے اور مختلف متون قرآنی کا دعوی یورپ بلا دلیل ہے، تفسیر کبیر رازی پر ریویو محض تبصرہ نہیں تاریخ تفسیر کی تحقیق ہے کہ سورہ فتح تک تفسیر امام ہے، اس کے ماخذ، علما کی آرا اور اس کی خصوصیات اور خامیوں کا تجزیہ ہے۔

ان مضامین قرآنی اور بعض دوسری نگارشات شبلی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے علوم جلیلہ سے پوری اور متبحرانہ آگاہی رکھتے تھے، سیرت النبی وغیرہ میں بعض معارف د

لطایف قرآنی کا بھی سراغ لگتا ہے جن میں قرآن وحدیث کی جامعیت وتطبیق اور آیات قرآنی سے اصول سازی اور پھر حیات انسانی کے مختلف میادین میں ان کی اطلاقی کیفیت اہم ترین ہیں۔

قرآن مجید سے اصول درایت اخذ کرنے کی مولانا شبلی نے ایک نئی طرح ڈالی ہے اور نئی روایت قایم کی ہے، سورہ حجرات - ۱۰ سے ایک اصول تحقیق اخذ کیا کہ راوی اور کاتب فاسق ہو تو جستجو ضروری ہے اور معتبر وعادل کا بیان ہی قابل اعتبار ہے، سورہ نور کی آیت کریمہ - میں مذکور واقعہ افک سے متعلق فرمان الٰہی ہے کہ سنتے ہی کیوں نہ اسے بہتان عظیم سمجھ لیا،'' اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے'' (سیرۃ النبی، ۱/ ۴۲) مولانا شبلی نے درایت کی ابتدا صحابہ کرام کے زمانے سے تسلیم کی ہے اور بہ طور ثبوت حضرت ابن عباس کا نقد بہ روایت حضرت ابو ہریرہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے آگ سے گرم شے کے استعمال سے وضو ٹوٹنے والی روایت کو مسترد کر دیا تھا، پھر درایت کے اصول کے منضبط کرنے اور ان اصول کے بیان کرنے کا باب ہے جو شبلی نے حافظ ابن الجوزی سے نقل کیا ہے، اس سے زیادہ اہم ان کا یہ تبصرہ ہے کہ فتح المغیث کی عبارت غلط چھپی ہے اور'' یہ اصول خود ابن جوزی کے قایم کردہ نہیں ہیں بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے''۔ (سیرۃ النبی، ۱/ ۴۳، بالخصوص حاشیہ نمبر-۱)

**حدیث واصول حدیث** سیرت نبوی اور حدیث نبوی کا تعلق چولی دامن کا بتایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فن سیرت علم حدیث کا زائیدہ ہے، تدوین حدیث کی تاریخ میں ان دونوں کے باہمی تعلق اور زمانی ارتقا پر ناقابل تردید شہادتیں ملتی ہیں جن کو جدید محققین نے اور مستحکم کر دیا ہے، مولانا شبلی نے سو سال قبل اس حقیقت کا سراغ لگا لیا تھا کہ تدوین حدیث اور کتابت فن کا کام عہد نبوی میں شروع ہو چکا تھا، اس سے زیادہ ان کے فہم وتدبر کا یہ ثبوت اہم ہے کہ وہ کتابت حدیث کی ممانعت کرنے والی احادیث نبوی کا صحیح تجزیہ کرتے ہیں اور کتابت احادیث کی اجازت نبوی اور صحف احادیث کی تدوین کی احادیث وروایات کو ترجیح دے کر تطبیق وتوفیق کا کام انجام دیتے ہیں، ان ضمن میں وہ صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، صحیح بخاری، خطیب بغدادی، ابن عبدالبر، سنن ابن ماجہ، ذہبی وغیرہ سے مواد پیش کرتے ہیں، عہد نبوی کے سرمایہ حدیث کو مولانا شبلی نے چار اقسام میں



رکھا ہے: (۱) صحف صحابہ کرام - عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، علیؓ، انسؓ وغیرہ، (۲) تحریری احکام اور معاہدات اور فرامین نبوی، (۳) سلاطین وامرا کے نام خطوط نبوی اور (۴) پندرہ سو صحابہ کی فہرست، یہ خالص حدیثی سرمایہ ہے اور اس کے مغازی کا سرمایہ تھا جو اسی عہد میمون میں مرتب ہوا اور بعد کے اسلامی ادوار میں ارتقا پذیر ہوا (سیرۃ النبی، ۱/ ۱۴-۱۹ ومابعد، مغازی کے فن کے ارتقا اور اس کی کتب پر کافی مفصل بحث کی ہے: ۱/ ۱۹-۳۸ ومابعد) سیرۃ النعمان، ۱۰۹-۱۱۳ میں تدوین حدیث، روایت ودرایت، وضع حدیث، صحاح کی قلت وغیرہ پر خاصی مفصل بحث ہے۔

فن اسماء الرجال پر جو سیرت وحدیث دونوں کا معیار نقد واعتبار ہے، مولانا شبلی کی بحث بڑی اہم ہے اور مفصل بھی، رجال کی کتب قدیم اور مصنفین پیشرو کے علاوہ متداول اور دستیاب کتب پر انہوں نے بڑی ماہرانہ بحث کی ہے اور اپنے ذاتی مطالعہ کا ذکر کیا ہے کہ'' اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء، ہماری نظر سے گزری ہیں'' (سیرۃ النبی، ۱/ ۴۱) مولانا نے سورہ حجرات - ۱۰ اور حدیث نبوی: کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع'' سے اس اصول تحقیق - اسماء الرجال - مستفاد مانا ہے جو قرآن وحدیث کے باہمی تعلق وربط کو بھی اجاگر کرتا ہے، روایت حدیث ومغازی پر مولانا شبلی کی بحث بعض فنی اصول وقواعد سے متعلق ہے جیسے روایت بالمعنی وغیرہ اس پر بحث ذرا دیر بعد آتی ہے۔

حدیث کے اصول درایت میں بحث شبلی کافی مدلل اور مفصل ہے، پہلے اصول درایت، عادل وضابط کی روایت کے بعد دوسرا اصول درایت یہ بتایا ہے کہ بیان کردہ واقعہ عقلی شہادت کے مطابق ہونا چاہیے، درایت کی ابتدا کا سراغ انہوں نے قرآن مجید میں مذکور واقعہ افک سے متعلق آیات سورہ نور - ۱۲ میں لگایا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں نے سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ واقعہ افک سراسر جھوٹا ہے اور وہ ممکن ہی نہیں، رسول اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کے معاملہ میں بالخصوص اور عام صحابہ واولیا وعلما کے بارے میں بالعموم یہ اصول درایت بروئے کار لانا

چاہیے، ان کی عظیم شخصیات اور عظیم تر کردار ایسے افترا کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔

روایات مغازی پر نقد محدثین بالخصوص امام احمد بن حنبل کے تبصرہ کی تین کتابوں کے کوئی اصول ہی نہیں اور مغازی، ملاحم اور تفسیر ہی کی توجیہ و تاویل خطیب بغدادی کے قول و تبصرہ سے کی ہے، کیوں کہ تبصرہ امام گرامی قدر مطلق ہے اور اس کا کوئی بھی قایل نہیں ہے، لہٰذا وہ مولفین اور ان کی کتابیں مراد ہیں جو اپنا مواد ہی ''کذب'' کے خمیر سے اٹھاتے ہیں جیسے کلبی، مقاتل بن سلیمان وغیرہ، ان میں واقدی کو بھی شامل کیا ہے لیکن مولانا شبلی نے امام شافعی وغیرہ ناقدین کے زیر اثر ان کو بھی جھوٹوں میں شمار کیا ہے حالاں کہ ان سے مراد امام واقدی کی طرف منسوب جعلی کتب، فتوح الشام و فتوح العراق وغیرہ مراد ہیں، ان کی کتاب المغازی واحد اصلی دستیاب کتاب ہے اور وہ کافی معتبر روایات رکھتی ہے، جہاں تک اس کے ''ضعاف'' کا معاملہ ہے تو ایک جدید تحقیق کے مطابق تمام روایات مغازی کسی نہ کسی شکل میں مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہیں اور ناقدین حدیث نے تو اس میں بھی ضعاف کا پتہ لگایا ہے اور علامہ البانی نے سنن کی معتبر کتابوں میں بھی ان کا سراغ لگالیا ہے۔ (سیرۃ النبی، ۱/ ۱۷-۱۹، امام واقدی پر مضمون خاکسار، البانی کی ضعیف ابی داؤد وغیرہ)

نقد حدیث پر محدثین کرام کے اصول سے بہت عمدہ بحث امام ابن الجوزی، امام بخاری، حافظ ذہبی، ملا علی قاری، خطیب بغدادی وغیرہ سے نقل کیا ہے جو موضوعات کے موضوع پر اپنے ایجاز و اختصار اور جامعیت و تجزیہ کے لحاظ سے نادر اور خاصہ کی چیز ہے، مولانا شبلی نے جس طرح ان کا خلاصہ لکھا ہے اور پھر وضعیت کے جراثیم کا سراغ لگایا ہے وہ ان کے تبحر فن کی دین ہی کہی جاسکتی ہے، بالخصوص حافظ ابن جوزی پر ان کا تبصرہ کہ ان کے وضع کردہ اصول نقد حدیث دراصل محدثین کرام کے ایجاد کردہ ہیں اور فتح المغیث کی غلط سلط طباعت پر نقد شبلی ان کی وسعت مطالعہ اور متنی گرفت کا غماز ہے کیوں کہ وہ بہت سی کتب پر ایسے طباعتی تبصرے کرتے ہیں۔ (سیرۃ النبی، ۱/ ۴۳-۴۷)

مقدمہ سیرت النبی میں جلی عنوان -تبصرہ- کے تحت مولانا شبلی نے کتب حدیث و سیرت میں فرق مراتب پر جو بحث کی ہے وہ ان کی فن حدیث سے واقفیت کو بہت خوبصورتی سے اجاگر



کرتی ہے اور اسی طرح فن سیرت پر عبور کامل بیان کرتی ہے۔ ان کا پہلا جملہ ہی بہت قابل قدر ہے: ''سیرت کی کتابوں کی کم پایگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کردی گئی''، اپنے اس مختصر و جامع تجزیہ کو حافظ عراقی (سیرت منظوم) علامہ ابن تیمیہ (کتاب التوسل) امام حاکم (مستدرک) اور ان کے حوالے سے کتاب ابوالشیخ اصفہانی، ملا علی قاری (موضوعات) امام طبری وغیرہ کے اقوال و تجزیے ہی نہیں نقل کیے بلکہ ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ پر نقد بھی کیا ہے کہ ''حدیث اور روایت کے امام'' ہونے کے باوجود خلفا اور صحابہ کے فضایل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف نقل کرتے تھے، مولانا مرحوم نے امام بخاری و امام مسلم، سنن ثلاثہ (نسائی، ابن ماجہ، ترمذی) اور روایات بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ کا ایک موازنہ کرنے کے بعد اصول دریافت کیا ہے کہ ''...... جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں''، سیرت کی کتابیں ایسی ہی فروتر اور کمزور و ضعیف کتابوں پر مبنی تھیں اور ان میں محدثین کے اصول روایت نظر انداز کردیے گئے جیسے موصول روایات ہوں اور منقطع نہ ہوں، کتب سیرت میں کتب حدیث کی معتبر روایات سے بے اعتنائی، مصنفین اور قدما کی اندھی پیروی، متاخر مولفین سیرت کی تدلیس، اصول روایت کی رو سے مختلف مدارج کی عدم رعایت، واقعات میں سلسلہ علت و معلول کا نظر انداز کرنا، نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کے معیار کا عدم قیام وغیرہ، مولانا نے ایک بہت عمدہ تبصرہ یہ بھی کیا ہے کہ ''ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے روات ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں''۔ (سیرۃ النبی، ۱/ ۴۸-۴۹ و مابعد)

خالص نقد حدیث کے لحاظ سے مولانا شبلی نے بعض اصولی بحثیں کی ہیں اور ان کو ماخذ سے مستند اور دلایل سے مستحکم کیا ہے، صحابہ کرام میں روات کے مدارج کے لحاظ سے روایات کا اخذ و قبول اور فقہائے صحابہ اور غیر فقہا کی تفریق، صحابہ کرام کا نقد و استدراک احادیث، نوعیت واقعہ کے لحاظ سے ثقاہت و فقاہت اور شہادت کے معیار کی بلندی اور انضباط کے مدارج کی رعایت،

کم سن اور مسن کی روایت کا فرق، کم سن کی روایت کی عدم حجت، محدثین کرام کا اس پر اصولی اختلاف، ضبط کی دو قسموں - ظاہر و باطن - کا فرق، حدیث کے متن میں قول و عمل و تقریر نبوی اور راوی کا اپنا بیان یعنی ادراج کا مسئلہ، قیاس و درایت کے اصول کا اثر اور دوسرے قوانین نقد مولانا مرحوم کی یہ بحث عظیم ترین ماخذ حدیث پر مبنی ہے، حافظ ابن الجوزی ان میں اہم ترین اور ان کی کتاب فتح المغیث بنیادی معلوم ہوتی ہے، دوسرے ماخذ میں امام بخاری، ابن مدینی، ابوحاتم، ابن حجر، دمیاطی، زرقانی، ابوداؤد، امام مسلم، ان کے شارح امام نووی، علامہ مازری، امام احمد، امام بیہقی، ابن جوزی وغیرہ کے علاوہ ان کی بہت سی کتابوں صحیح بخاری صحیح مسلم، کتاب المدخل، شرح قسطلانی وغیرہ شامل ہیں۔ (۱/۴۸-۷۲ و مابعد)

لیکن مولانا شبلی کی جس بحث نے روایتی علما کے حلقوں میں کہرام برپا کر دیا وہ قیاس و درایت کے تحت بعض روایات صحیح بخاری وغیرہ پر ان کی تنقید ہے، وہ اس باب میں اکیلے نہیں ہیں، ان کو امام رازی وغیرہ کی تائید و حمایت حاصل ہے اگرچہ علامہ قسطلانی نے امام رازی پر نقد کر کے ان کی خطا واضح کی ہے، یہ بحث صحیح بخاری کی حضرت ابراہیم کے بارے میں ثلاث کذبات کی روایت ہے، مولانا شبلی امام رازی کے اس رجحان سے متفق معلوم ہوتے ہیں کہ کسی نبی مکرم کی نسبت جھوٹ کا شبہ کرنے کی بجائے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں یا راوی کی خطائے مفہوم پر اسے محمول کر لیں لیکن روایت کے پابند محدثین اسے نہیں مانتے، مولانا نے دوسرا اصول اس کے بالمقابل ان لوگوں کا بیان کیا ہے "جو دلائل عقلی اور قراین حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے"، حدیث حضرت ابوہریرہؓ: مما مسته النار پر حدیث ابن عباسؓ کے ذریعہ نقد، صحیح مسلم کے مقدمہ کے حوالے سے حضرت علیؓ کے بعض قضایا پر نقد حضرت موصوف، حضرت محمود بن ربیعؓ کی حدیث مغفرت پر نقد حضرت ابوایوب انصاریؓ، تیمم کی حدیث عمارؓ پر نقد حضرت عمرؓ اور نوحہ کی بنا پر مردہ پر عذاب کی حدیث ابن عمرؓ پر نقد حضرت عائشہؓ وغیرہ کی متعدد تنقیدات کو نقل کر کے دوسرے گروہ کی تائید لاتے ہیں (سیرۃ النبی، ۱/۶۹-۷۵ و مابعد)، مولانا نے جو اصول دریافت کیا ہے کہ "صحابہ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو ان کے روات ثقہ اور



مستند ہوتے تھے"، دوسری مثالیں بھی دی ہیں۔

روایت بالمعنی کو مولانا شبلی نے ایک "بڑا مرحلہ" قرار دے کر اس کی نزاکت اور ثقاہت کی رگ کو چھیڑا ہے، مولانا مرحوم روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کے ایک اہم فرق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ حدیث/لفظ نبوی کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ معنی میں فرق نہ آئے روایت بالمعنی ہے لیکن "مطلب ادا ہوا یا بدل گیا ایک اجتہادی بات ہے"، وہ روایت بالمعنی کی سہولت اور روایت باللفظ کی دقت کو بیان کرنے کے بعد محدثین کرام کے دو گروہوں کا ذکر کرتے ہیں اور روایت بالمعنی کرنے والوں میں سفیان ثوری، واثلہ بن اسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور شعبی کے اقوال ترمذی، کتاب العلل کے حوالے سے نقل کیے ہیں، وہ متعدد صحابہ کرام اور محدثین عظام جیسے حضرات ابن مسعود و ابن عمر وغیرہ امامان مالک و سائب وغیرہ کی احتیاط و حزم کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن "ثقہ سے غلطی کے صدور" کے امکان کو نظر انداز نہیں کرتے، اسی طرح روایت احاد پر اہل فن کے تسلیم و انکار اور اختلاف پر بحث کر کے کہتے ہیں کہ "اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہ کا طرز عمل اس کے مخالف ہے"، حضرات عمر فاروق اور ابوموسیٰ کی بحث حدیث استئذان اور دادی کی میراث پر حضرت ابوبکر صدیق کی تائید/شاہد طلبی اور جنین کے باب میں حدیث حضرت مغیرہ پر حضرت عمر فاروق کی عدم قبولیت وغیرہ کی مثالیں دی ہیں، یہ بحث ان کی فقہی فہم کا عنصر بھی رکھتی ہے۔ (۱/۷۸-۸۳)

مقدمہ سیرت میں احادیث کی روایت و نقد سے متعلق بحث کا ایک جزوی حصہ (۷۷-۷۹) مولانا سلیمان ندوی کا اضافہ و زیادت ہے تاہم وہ بنیادی طور سے مولانا شبلی کا ہی نتیجہ فکر ہے اور اس کو انہوں نے خاتمہ میں گیارہ نکات بنا دیا ہے، ان سے مولانا شبلی کی فنی دراکی کا اندازہ اور علم دین کے دوسرے یا توام عظیم ترین سرچشمہ پر قدرت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے، مزید مباحث کتاب سے اس کو مدلل و آراستہ کرنا ایک دوسرا دفتر حدیث تیار کرنے کے مترادف ہوگا، اس کے باوجود چند مثالیں مختصر طور سے دوسرے مباحث سے بھی پیش کی جا رہی ہیں تاکہ فن حدیث سے مولانا شبلی کی گہری واقفیت بلکہ عبقریت ثابت ہو جائے۔

۱- رسول اکرم ﷺ کی فصاحت و بلاغت سے متعلق سہیلی کی الروض الانف سے صحیح حدیث نقل کی ہے۔ (۱/ ۱۷۲)

۲- دادا عبدالمطلب ہاشمی کی کفالت نبوی اور آپ ﷺ کے بکریاں چرانے کے عمل نبوت کے لیے بخاری کی روایات نقل کی ہیں اور حدیث رعی الغنم میں قراریط کے معنی کے صحیح تعین کے لیے بخاری کی کتاب الاجارہ اور ابن جوزی کی بحث کی تایید پیش کی ہے۔ (۱/ ۱۷۷-۱۷۸)

۳- بحیرا راہب سے متعلق تمام روایات کو مرسل، مجہول اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے، حدیث ترمذی کو حسن غریب کے درجہ میں پا کر اسے صحیح سے فروتر اور کم رتبہ مانا ہے، حاکم مستدرک کی رائے اور تصحیح روایت ترمذی پر علامہ ذہبی کا نقد ورد نقل کر کے اس سے اتفاق کیا ہے، حاکم کا اس روایت کو شرط شیخین کے مطابق قرار دینا قابل نقد ہے، اگرچہ شبلی نے اس پر کلام نہیں کیا، محدثین کرام کا ایک بڑا طبقہ امام حاکم کے شرط صحیحین/شرط بخاری/شرط مسلم پر قرار دینے کے اصول کو ان کے اجتہاد پر مبنی مانتا ہے جو ضروری نہیں کہ صحیح ہو، مولانا شبلی نے حافظ ابن حجر پر ''روات پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرنے'' پر نقد کر کے خود ان ہی کی کتاب تہذیب التہذیب سے اس روایت کے ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان کی خطا کرنے کو ثابت کیا ہے اور روات میں بعض کے ناقابل ثقہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ (۱/ ۱۷۸-۱۸۱)

۴- حلف الفضول کے تسمیہ کے لیے امام بیہقی کی روایت مسند حارث بن اسامہ نقل کی ہے: ترد الفضول علی اهلها۔ (۱/ ۱۸۳)

۵- رسول اکرم ﷺ کی قبل نبوت زندگی کے لیے مولانا شبلی نے بہت احادیث و روایات اور ان کی کتب معتبر کو نقل کیا ہے اور بعد نبوت زندگی کے لیے دونوں ادوار مبارک میں قدم قدم پر روایات حدیث سے استناد کیا ہے اور صحیح روایات کا التزام رکھا ہے، ظاہر ہے کہ مولانا شبلی اپنی فکر و نظر کے مطابق کتب سیرت سے بھی روایات لیتے تھے اور بہت چھان پھٹک کر لیتے تھے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنے اصول درایت کے مطابق روایت حدیث پر روایت سیرت کو ترجیح دی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، نہ ہی ان کے اصول ترجیح کے خلاف



ہے کہ متعدد حافظ سیرت نگاروں نے بالخصوص حافظ مغلطائی نے روایات سیرت کو کبھی احادیث پر ترجیح دی ہے اور وہ بھی احادیث بخاری پر اور ان پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی خطا ظاہر کی ہے۔ (۱/ ۱۹۰ و مابعد، سیرت مغلطائی)

شبلی نقد روایات حدیث میں بعض کا بہ طور خاص ذکر کیا جاتا ہے، وہ صرف بہ طور حوالہ ہے، مفصل بحث کتاب سیرت میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

۱- فترۂ وحی کے دوران رسول اکرم ﷺ کی مبینہ خودکشی (پہاڑ سے گرا دینے کی فکر) سے متعلق بخاری کی کتاب التعبیر اور اس سے متعلق حافظ ابن حجر پر ان کی شدید تنقید نے تمام روایت پسند حلقوں کو مولانا مرحوم پر دندان نقد تیز کرنے کا موقعہ دیا ہے لیکن ان کا یہ تبصرہ بہرحال قابل غور ہے کہ ''یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کردی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں''، مولانا مرحوم نے تو صرف سند مقطوع پر ہی بات ختم کردی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور بہت سے پیش رو محدثین اور اکابر ایمہ نے امام زہری کی کئی بالکل متصل روایات کو غلط قرار دیا ہے، شبلی شکن افترا پردازوں نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ پہاڑ سے گرا دینے والا حصہ بلاغات زہری میں سے ہے اور متصل نہیں ہے، مولانا شبلی کو تو صرف اسی غیر متصل / مقطوع حصہ پر ہی اعتراض ہے، ان ناقدین کرام نے خلط مبحث کر کے مولانا مرحوم کو صحیح حدیث بخاری سے انکار کا مجرم قرار دیا ہے ''جو دیتے ہیں دھوکہ بازی گر کھلا'' کے مترادف ہے، اس پوری بحث میں مولانا اسحاق کلکتوی، مولانا فخرالدین احمد، مولانا ادریس کاندھلوی اور ان کے خوشہ چینوں بلکہ جامد مقلدوں کا موقف بالکل صحیح نہیں، مولانا شبلی کی تمام درایتی اور روایتی تنقیدیں اس حدیث بدءالوحی کے حصہ فترۂ وحی میں مبینہ خودکشی کے فقرہ کے بارے میں بالکل صحیح ہیں، (۱/ ۲۰۳-۲۰۵، ابن حجر، فتح الباری، ریاض ۱۹۹۷ء، ۱۲/ ۴۵۰-۴۵۲: ...... ومعنى الكلام ان فى جملة ما وصل الينا من خبر رسول الله ﷺ فى هذه القصة وهو من بلاغات الزهرى وليس موصولا ...... فصار كله مدرجا على رواية الزهرى وعن عروة عن عايشة ...... حافظ موصوف کو خود بھی اعتراف ہے کہ وہ بلاغات زہری ہی میں سے

نہیں اوراج کا معاملہ ہے اور اوراج لازمی طور سے قابل قبول نہیں، اس کی صحت کی شروط ہیں،
ناقدین کرام نے یہ بحث بالکل نہیں چھیڑی کہ کیا ایک نبی مرسل ﷺ خودکشی جیسے جرم و گناہ کے
ارتکاب کو سوچ بھی سکتا تھا، مولانا شبلی کا نکتہ یہی ہے)۔

۲-'' ابوطالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے لیکن چوں کہ بخاری کی روایت عموماً
صحیح تر مانی جاتی ہے اس لیے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں لیکن محدثانہ حیثیت سے
بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں ...... اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں
لکھا ہے کہ '' روایت مرسل ہے''، ناقدین شبلی کا ایک اور المیہ ہے کہ وہ صرف مولانا کو معرض نقد
بناتے ہیں، ان میں سے کسی نے علامہ عینی کے اس تبصرہ ونقد سے بحث نہیں کی اور کی ہے تو تشنہ
ہے، مولانا شبلی نے اس کے لیے عینی کی کتاب الجنائز کا حوالہ دیا ہے (ج ۴، ص ۲۰۰) اور تو اور
مولانا مرحوم کے شاگرد رشید مولانا سلیمان ندوی کو بھی استاد گرامی کے نقد ونظر سے اختلاف تھا
جس کی انہوں نے دوسری احادیث صحیحہ کے ذریعہ تردید کی ہے اور باب قصۃ ابی طالب کی
حدیث کی بنا پر اس کو متصل بھی قرار دیا ہے، مولانا شبلی کا نقد صحیح ہو یا نہ ہو یا ان کی فکری غلطی ہو لیکن
بہر حال علما و محدثین اور صوفیہ کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ابوطالب اسلام لا چکے تھے، اس طبقہ
کے دلایل اور ان کی بنا پر ان کا نقطہ نظر مرجوح نظر آتا ہے اور اسی طرح فکر و استدلال شبلی کا معاملہ
ہے، البتہ اسلام ابی طالب کے حامی دیگر محدثین و اہل علم و تصوف پر نقد ان معاندین شبلی نے نہیں
کیا ہے۔(۱/۲۴۸-۲۴۹)

۳- بلاشبہ مراسیل صحابہ کرام کے باب میں مولانا شبلی الجھن کا شکار ہیں اور پسند و ناپسند
کے مطابق چلتے ہیں، ایمان و کفر ابی طالب ہاشمی کے باب میں انہوں نے حضرت مسیب بن
حزن کی روایت محض اس لیے مسترد کر دی کہ وہ فتح مکہ کے مسلمان تھے اور واقعہ کے عینی شاہد نہ
تھے لیکن بدء الوحی کی پوری حدیث حضرت عائشہؓ قبول کر لی، حالاں کہ وہ مراسیل صحابہ میں آتی ہے
کہ وہ تو اس وقت تک پیدا بھی نہ ہوئی تھیں، اس سے زیادہ حیرت انگیز رویہ حدیث ہجرت کے
سلسلہ میں ملتا ہے کہ '' امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور
حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان



در حقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہی ہے کہ انہیں سے سن کر کہا ہو گا اور ابتدائے
واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں'' (۱/۲۶۹)، اسی بنا پر محدثین و فقہا مراسیل صحابہ کو حجت مانتے ہیں
ان کا اختلاف مراسیل تابعین کی حجیت پر ہے، بعض ان کی بھی صحت کے قایل ہیں اور بعض فقہا
بعض شروط کے ساتھ مراسیل تابعین کو تسلیم کرتے ہیں، بہ قول شاہ ولی اللہ دہلوی امام شافعی گو
مراسیل تابعین کو غیر مشروط طور سے قبول نہیں کرتے مگر حضرت سعید بن مسیب کے مراسیل کو قبول
کر لیتے ہیں کہ وہ سب مرفوع احادیث سے مستند ہیں۔ (مصفیٰ ۱)

۴- غزوات نبوی کے سلسلہ میں جو روایات آتی ہیں یا احادیث نبوی ان میں سے
متعدد میں بالخصوص ابتدائی مہموں کے بارے میں ان میں راوی اول، صحابی ہوں یا تابعی وغیرہ
اور مولفین سیرت بالعموم اپنے قیاس و استنباط کی بنا پر غزوہ یا سریہ زیر بحث کا مقصد بیان کر دیتے
ہیں، امام سیرت ابن اسحاق اور دوسروں نے بھی رسول اکرم ﷺ کے اولین غزوات، ودان،
ابواء، بواط، ذوالعشیرہ کے بارے میں '' یرید عیر قریش '' کا سکہ بند جملہ لکھ دیتے ہیں اور
یہی استنباط و قیاس حدیث کی روایات میں بھی در آیا ہے جیسے غزوہ بدر سے متعلق حضرت کعب بن
مالک کی مشہور روایت میں ہے، مولانا شبلی کا نقد بالکل درست ہے کہ وہ راوی کا قیاس ہے،
بیان رسول اکرم ﷺ یا فعل نبوی کا اثبات نہیں ہے، روایات و احادیث کی تنقیح اور تاویل میں
تمام مجموعی روایات کی بنا پر فیصلہ کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا اصول ہے، ذکر آچکا ہے کہ روایات
صحابہ میں سے کتنی ہیں جن کو تابعی اور بعد کے علما و ناقدین کے دلایل پر رد بھی کیا گیا ہے، یہ
اصول قطعی بے لچک نہیں ہے کہ ہر ہر روایت حدیث کو روایت سیرت پر ترجیح حاصل ہو گی ورنہ
اصحاب سیرت کی تمام روایات دریا برد کرنی ہوں گی جیسا کہ اکرم ضیاء عمری اور ان سے زیادہ
مسعود احمد اور دوسرے غالی حضرات نے وطیرہ بنا لیا ہے، اس پر مفصل بحث کہیں اور کر چکا ہوں۔
(ملاحظہ ہو مضمون خاکسار: عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں - محرکات، مسایل اور مقاصد، نقوش
رسول نمبر)

غزوہ بنی مصطلق رمریسیع کے باب میں بالعموم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دو طرح کی
متصادم روایات ملتی ہیں: ایک کتب حدیث اور محدثین کی اور دوسری روایان سیرت و اہل سیر کی،

دونوں میں وجہ اختلاف یہ ہے کہ اول الذکر کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے قبیلہ بنو المصطلق پر ان کی بے خبری میں حملہ کیا تھا جب کہ موخر الذکر کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان پر باقاعدہ اعلان واظہار جنگ کر کے حملہ کیا تھا، اہل سیرت نے یہ متفقہ اصول نبوی بھی نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کبھی کسی دشمن پر اچانک حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ اتمام حجت کے بعد کرتے تھے اور یہی اسلام کے مجموعی اصول جنگ کی تعلیم ہے، مولانا شبلی نے صحیحین کی روایت حضرت نافع کو منقطع قرار دے کر اس پر بحث کی ہے اور انقطاع کی علت کے سبب اسے مسترد کر دیا ہے، بلاشبہ مولانا سے یہ چوک ہوئی کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کا آخری جملہ نہیں دیکھا اور نہ اس کا وصل دیکھ لیتے، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل، مسند شافعی، بیہقی کی سنن کبری وغیرہ میں یہ روایت موصول آئی ہے، مولانا مرحوم نے ابن سعد کی روایت کو ترجیح دی ہے جو واقدی کی بتائی جاتی ہے، حالاں کہ وہ ہر حدیث میں کذاب نہ تھے، حافظ ابن حجر ہوں یا امام عبدالبر قرطبی یا امام ابن حزم اور دوسرے محدثین کرام و علمائے حدیث، وہ بہر حال روایات حدیث کو ترجیح دیتے ہیں، ناقدین کرام نے بخاری کی مذکورہ بالا روایت پر مولانا شبلی پر استدراک سلیمانی کا حوالہ نہیں دیا جو اسی صفحہ پر موجود ہے اور جس میں اس کو موصول بتایا ہے (۱/ ۴۱۵، حاشیہ ۲)، ان روایات پر حافظ مغلطائی وغیرہ کا نقد نظر انداز کر دیا گیا ہے، پھر حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے امامانِ حدیث نے دونوں قسم کی روایات واحادیث کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، پھر یہ سوال ہوگا کہ راجح قرار دینے کے بعد مرجوح یا قابل رد سے تطبیق دینے کے کیا معنی؟ ان روایات کا بالخصوص اور دوسرے غزوات کے باب میں حدیث وسیرت کے تصادم کا معاملہ دراصل سیدھا سادہ ہے، محدثین کرام کی روایات صرف ایک پہلو اور واقعہ کے ایک حصہ کے بارے میں ہیں، سیرت کی روایات میں ان کا پورا پس منظر آتا ہے اور وہ مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں، اسی بنا پر حافظ ابن حجر نے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے پہلے کئی مواقع پر اتمام حجت کرنے کے بعد حملہ کیا تھا، دراصل بنو المصطلق کو اس اچانک حملہ کی توقع نہ تھی، ورنہ وہ آپ ﷺ کے اعلان جنگ سے واقف ہو چکے تھے، ناقدین کرام نے امام ابن سعد کا ایک تبصرہ عیون الاثر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حدیث ابن عمر کو بیان



کر کے اس پر اپنی اور ابن اسحاق کو ترجیح دی تھی، اب رہا مولانا شبلی کے اس روایت حدیث کو مسترد کرنے یا حدیث پر سیرتی روایت کو ترجیح دینے کا معاملہ تو وہ ان کے ایک اور اصول کے عین مطابق ہے کہ وہ ہر روایت کو مسترد کر دیں گے جس سے نبی مکرم ﷺ کے دامن عصمت ونجابت و عدالت پر حرف آتا ہو، اسی بنا پر انہوں نے فترۂ وحی کے باب میں بلاغ زہری کو مسترد کیا اور اسی کے سبب وہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جھوٹ بولنے کی روایت کو محل نظر بتاتے ہیں، ایک اور اصولی بات محدثین کرام نے بالعموم غزوات کے باب میں ارباب سیرت ہی سے روایات لی ہیں ۔(فتح الباری، ۷/ ۵۳۸: اشار ابن سعد الی حدیث ابن عمر ثم قال: الاول اثبت ......الخ)

حضرت امام بخاری کی جلالت شان اور فنی تبحر ودراکی اور عدالت وثقاہت کے باوجود ان کی روایات پر نقد کیا گیا ہے، امام دارقطنی کی تنقید بخاری معروف ہے اور ایک جدید مطالعہ تقابل نے اگرچہ امام بخاری کو غالب معاملات میں ترجیح دی ہے لیکن بعض روایات میں امام دارقطنی کی تنقید سے اتفاق کیا ہے، حافظ مغلطائی نے اپنے مختصر السیرۃ کئی مقامات پر اغلاط بخاری پر تنبیہ کی ہے اور نقد بھی، خاص غزوہ بنی المصطلق کے باب میں ایک اور نقد بخاری ملتا ہے کہ امام موصوف نے غلطی رسہو سے اس غزوہ کی تاریخ شعبان ۴ھ کی نسبت امام موسیٰ بن عقبہ کی طرف کر دی، حالاں کہ بہ قول ابن حجر وہ سہو قلم ہے، امام موسیٰ بن عقبہ نے ۵ھ ہی لکھا ہے، سیرت شبلی میں نقد واستدراک بخاری موجود ہے مگر ناقدین شبلی نے اس پر بحث تو درکنار حوالہ تک نہ دیا، اس باب میں تو حافظ ابن حجر کا نقد موجود ہے۔(فتح الباری، ۷/ ۵۳۶-۵۳۷: (وقال موسی بن عقبہ سنۃ اربع )کذا ذکرہ البخاری ، وکانہ سبق قلم اراد ان یکتب سنۃ خمس فکتب سنۃ اربع ، والذی فی مغازی موسی بن عقبہ من عدۃ طرق اخرجہا الحاکم ...... فی شعبان سنۃ خمس ......الخ)

دوسرے غزوات وسرایا پر بھی بعض تنقیدات ملتی ہیں جیسے غزوہ موتہ سے واپس آنے والوں پر ''فراری'' کا الزام لگانے کی روایت سیرت کی ترجیح یا غزوہ حنین میں وہلۂ اول میں مسلمانوں یا رفقائے خاص کے فرار ہونے کی بات پر نقد کیا ہے کیوں کہ بخاری کی روایت براء بن

عازب میں اولین فتح کے بعد غنایم پر ٹوٹ پڑنے کے سبب شکست ہوئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے نقد سلیمانی میں اسی کو دہرایا ہے، مولانا ندوی کا استدراک دونوں مقامات پر بالخصوص غزوہ موتہ کے باب میں بہت مفصل ہے (۱/ ۵۰۷-۵۰۸ حاشیہ: ۴، غزوہ موتہ میں مولانا شبلی کا محض ایک فقرہ '' شکست خوردہ فوج'' پر یہ ساری تنقید ہے اور دوسرے جملہ واپس آنے والے مسلمانوں کو فراری کہنے پر، متعدد اہل علم سے جن میں محدثین بھی شامل ہیں، ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل مدینہ کا عام تاثر تھا اور وہ انہیں فرارون کہتے تھے اور اسی بنا پر رسول اکرم ﷺ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے '' کرارون'' قرار دیا تھا)۔

غزوہ حنین کے تعلق سے مولانا شبلی پر نقد شبلی خاصا مفصل و مدلل ہے لیکن قرآن مجید کی آیت کریمہ توبہ - ۴ کا حوالہ نہ مولانا شبلی کے ہاں اور نہ کسی کے ہاں ہے، قرآن مجید خود مسلمانوں کو کثرت تعداد کی بنا پر بہ قول شبلی '' نازش'' ہوگئی تھی اور اسی کے سبب ان کو شکست و فرار کا زخم اٹھانا پڑا تھا، مولانا ندوی نے سارا الزام طلقائے مکہ کے سر دھر دیا ہے، مولانا شبلی نے بڑی خوبصورتی سے اس اولین ہزیمت کو بیان کیا ہے، یہ بحث اپنی تفصیلات و دلائل کے ساتھ مولانا شبلی کے حق ہی میں جاتی ہے، (سیرۃ النبی، ۱/ ۵۳۳-۵۴۰، فتح الباری، ۸/ ۳۴-۴۱ میں حدیث مسلم کی بنا پر کہا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ تنہا رہ گئے '' حتی بقی وحدہ'' پھر تطبیق دی گئی ہے کہ ثابت قدم پیچھے تھے، شبلی نے بھی تو صرف کہا ہے کہ رفقائے خاص میں بھی کوئی نہیں تھا)۔ (باقی)

---





# بدایوں میں غالب کے مخالفین و مداحین (۱)

## (عہد غالب میں)

از:- ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

غالب کے ہم عصر بدایونی علما، مصنفین اور شعرا میں بہت ہی صاحب علم و فضل ہیں، انہیں میں غالب کے مداحین و معترفین بھی ہیں اور ان کے مخالف و نکتہ چیں بھی، مرزا نے قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) کو اپنے ایک خط (محررہ، ۴/ اپریل ۱۸۶۴ء) میں لکھا تھا:

'' سہوان کے صاحب اگر '' قاطع برہان'' کا جواب لکھتے ہیں خدا ان کو یہ توفیق دے کہ عبارت کے معنی سمجھ لیں، تب جواب لکھیں''۔ (غالب کے خطوط، ج ۴/ ص ۱۵۰۹)

تحقیق کے باوجود علم نہ ہو سکا یہ کون صاحب تھے، راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں '' سہوان کے صاحب'' سے مراد منشی انوار حسین تسلیم سہوانی (ف ۱۸۹۲ء) لیے تھے، (دید و دریافت، ص ۲۳) بعد میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی اپنی کتاب '' غالب اور عصر غالب'' (ص ۱۸۹) میں میری کتاب کے حوالے سے اسی بات کو دہرا دیا۔ لیکن میرا یہ خیال غلط تھا، تسلیم غالب کے مداحوں میں تھے، تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے۔

'' برہان قاطع'' محمد حسین تبریزی کا فارسی لغت ہے جو ۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء میں لکھا گیا، یہ لغت سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد (۱۶۲۵-۱۶۷۴ء) میں گولکنڈہ میں مرتب ہوا، غالب نے '' برہان قاطع'' کی تنقید '' قاطع برہان'' کے نام سے لکھی، اس میں غالب نے برہان کی خامیوں

---

(۱) زیر تصنیف کتاب '' غالب اور بدایوں'' کا ایک باب۔

☆ ۵۸، نیو آزاد پرم کالونی، چھاؤنی اشرف خاں، آکزٹ نگر، بریلی، یوپی۔

کی نشان دہی کر کے ۲۸۴ الفاظ پر اعتراض وارد کیے، یہ کتاب مع تقریظ غالب مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شایع ہوئی، اس کتاب (قاطع برہان) کے شایع ہوتے ہی فارسی داں حلقوں میں ایک طوفان برپا ہوگیا، اس کے متعدد جواب لکھے گئے، مثلاً محرق قاطع برہان (۱۸۶۳ء) ساطع برہان (۱۸۶۵ء)، موید برہان (۱۸۶۵ء)، قاطع القاطع (۱۸۶۶ء)، غالب نے خود بھی ان کتب کے جواب لکھے اور ان کے تلامذہ ومتوسلین نے بھی۔ جن کی ایک طویل فہرست ہے، یہ بحث ۱۸۶۸ء تک چلی، آخر میں اس نے شاعری کی صورت اختیار کرلی اور دونوں جانب سے قطعہ در قطعہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، غور طلب امر یہ ہے کہ "قاطع برہان" کے رد میں پہلی کتاب ۱۸۶۳ء میں شایع ہوئی، ۱۸۶۴ء میں اس کا رد "سہسوان کے صاحب" رقم فرما رہے تھے، یعنی اگر سہسوان میں لکھی جانے والی کتاب منظر عام پر آجاتی تو "قاطع برہان" کے رد میں اور "برہان قاطع" کی تائید میں یہ دوسری کتاب ہوتی، اس کتاب کے تعلق سے یہ سوالات ہنوز قایم ہیں:

۱- سہسوان کے وہ کون بزرگ تھے جو قاطع برہان کی قطع وبرید فرمارہے تھے؟

۲- کیا وہ طبقہ علما سے تھے یا شاعروں کے اس طبقے سے جو محض اظہار برتری یا نام ونمود کے لیے باہم دست وگریباں رہتے ہیں؟

۳- اس رد کے لکھنے کا محرک کیا تھا؟

۴- یہ رد پایہ تکمیل کو پہنچا یا نہیں؟

۵- بدایوں میں غالب شکنی کے محرکات کیا تھے، مومن پرستی، ذوق پرستی، غالب کی شیعیت یا غالب کا شعری میدان میں روش عام سے ہٹا ہونا؟۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب "دید و دریافت" میں ذوق پرستی کو بدایوں میں غالب شکنی کا سبب قرار دیا تھا اور بدایوں میں ذوق کے تلامذہ اور ان تلامذہ کے تلامذہ کے ذریعے ذوق اسکول کے سلسلے در سلسلے کی وضاحت کی تھی اور ذوق سے موجودہ دور تک اس روایت کے اثرات کی نشان دہی کی تھی۔ (دید و دریافت ص ۲۴)

لیکن سید محفوظ الرحمان (سہسوانی) نے اپنے ایک مضمون "دید و دریافت - ایک مطالعہ"



میں لکھا:

"لیکن اس سوال کا جواب تشنہ ہے کہ بدایوں نے غالب کے دور میں غالب شکن کیوں پیدا کیے، مصنف کا یہ مفروضہ کہ ذوق پرستی نے غالب شکنی کے مزاج کو فروغ دیا، زیادہ صحیح نہیں، "برہان قاطع" کی قطع وبرید جو سہسوانی بزرگ فرما رہے تھے...... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی شیعیت سے شعرا وحکمائے سہسوان (جو غیر مقلد تھے) نالاں تھے، بایں سبب رد غالب میں سہسوانی پیش پیش رہے اور چوں کہ حکیم مومن خاں مومن غیر مقلد بھی تھے اور سہسوان سے مخصوص تعلق رکھتے تھے، لہذا مومن پرستی کے نتیجہ میں غالب شکنی سمجھ میں آنے والی بات ہے، جس کا وافر ثبوت مولانا اعجاز احمد (معجز) سہسوانی کا کارنامہ موازنہ "مومن وغالب" ہے جو اپنی جگہ غالب شکنی کی واضح دلیل ہے"۔ (رہنمائے تعلیم، دہلی، فروری ۱۹۸۲ء)

مذکورہ صدر اقتباس میں سید محفوظ الرحمان نے غالب کی شیعیت اور ذوق پرستی کے بالمقابل مومن پرستی کو غالب شکنی کا سبب قرار دیا ہے اور اس کی وجہ مومن کی طرح شعرا وحکمائے سہسوان کا غیر مقلد ہونا اور اسی بنیاد پر مومن کا سہسوان سے "مخصوص تعلق" ہونا لکھا ہے لیکن انہوں نے مومن کے سہسوان سے "مخصوص تعلق" کی وضاحت نہیں کی، جہاں تک راقم الحروف کی محدود معلومات ہے، بدایوں میں مومن کا کوئی شاگرد بھی نہیں تھا، سہسوان سے تعلق کی بنیاد تنہا ان کا "سفر سہسوان" ہے جو براہ بدایوں کیا گیا، بدایوں سے متعلق مومن کا ایک شعر بھی ملتا ہے:

بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی سے
یہ کیوں کر چارہ پند خرد منداں ہوش آیا

(کلیات مومن، ص ۱۸۰)

مقصد سفر کے متعلق اختلاف ہے، سید محمد عبدالباقی سہسوانی نے لکھا ہے:

"مومن نواب محمد سعید خاں سے جو اس زمانے میں سہسوان میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ملاقات کی غرض سے آئے اور یہیں پر مولانا تاج الدین نقوی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے"۔ (حیوۃ العلما، ص ۳۰)

مومن کے نواب محمد سعید خاں سے مخلصانہ روابط تھے جو ان دنوں بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر سہوان میں موجود تھے اور بعد میں ۲۰/ اگست ۱۸۴۰ء کو ریاست رام پور میں مسند آرائے سلطنت ہوئے، سہوان میں ۱۳/ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکٹری قایم ہوئی تھی اور مئی ۱۸۳۸ء کو یہ بدایوں منتقل کردی گئی، (ذوالقرنین بدایوں نمبر ۱۹۵۶ء، ص ۴۳) لہذا مومن ۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۸ء کی درمیانی مدت میں سہوان میں وارد ہوئے، مولانا تاج الدین نقوی (ف ۱۸۷۶ء) سہوان کے ایک جید عالم اور مسلک اہل حدیث کے حامل تھے، ضمیر الدین احمد عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ مومن اپنے ہم راز دوست حکیم مظہر علی انیس سہوان کے یہاں تشریف لے گئے اور حکیم مظہر علی کی تحریک پر شرح سدیدی و نفیسی لکھی۔ (حیات مومن، ص ۵۸، ۶۴)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا خیال ہے:

''سہوان کی آمد کا مقصد ایک طرف ان حضرات (یعنی نواب محمد سعید خاں اور مولانا تاج الدین نقوی) سے ملاقات تھی اور دوسری طرف ''صاحب جی'' کا عشق تھا''۔ (مومن شخصیت اور فن، ص ۱۱۰)

صاحب کی تشریح بعض سہوانی بزرگ یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک مغنیہ تھی جس پر مومن فریفتہ تھے، جو سخن گو و سخن سنج تھی، صاحب تخلص کرتی تھی، مومن نے اس کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے: مثلاً

صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

صاحب ''خوش معرکہ زیبا'' نے ان کا نام امۃ الفاطمہ بیگم تحریر کیا ہے اور انہیں مومن کا شاگرد لکھا ہے (ج ۲/، ص ۵۸۱) امۃ الفاطمہ کا ذکر متعدد تذکروں میں ملتا ہے، کسی تذکرہ نگار نے انہیں خانگی لکھا، کسی نے رنڈی، کسی نے طوائف اور کسی نے مغنیہ، یہ لکھنؤ سے دہلی آئی تھیں، واپسی میں براہ سہوان لکھنؤ گئیں، دہلی اور سہوان میں ان کا قیام کتنی مدت رہا اس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا، یہ درست ہے کہ مومن ان سے دل لگا بیٹھے تھے، اپنی مثنوی ''قول غمیں'' میں اس کے عشق کو موضوع بنایا ہے، اکرام بریلوی نے اپنی کتاب ''حکیم مومن خاں مومن'' (کراچی، ۲۰۰۳) میں



ان کے عشق کی داستان تفصیل سے درج کی ہے۔

سہوان سے متعلق مومن کے یہ چند اشعار ہیں جن میں ''صاحب جی'' کے عشق کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

صاحبو میرا حال مت پوچھو　　بندہ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہواں آیا　　ہرزہ گرد ولی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لیے　　شاکی بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں　　قابل رحم ہوگیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے ''صاحب'' تک　　کہ غلام گریز پا ہوں میں

(کلیات مومن، ص ۱۸۳)

دلدار نصری رام پوری مرحوم جو تاریخ کے اچھے اسکالر تھے، انہوں نے اپنے مضمون ''مولوی فضل حق خیرآبادی اور رام پور'' میں مومن کے مقصد سفر بدایوں و سہوان کے بارے میں بالکل نئی اطلاع دی ہے جس کی مجھے کہیں سے بھی سند نہیں مل سکی، خود انہوں نے بھی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، وہ لکھتے ہیں:

''مومن خاں تحریک سید احمد شہید کے سلسلے میں رام پور آئے تھے، اس وقت نواب احمد علی خاں صاحب حکم راں تھے، بدایوں بھی گئے تھے، جہاں محمد سعید خاں جو بعد میں رام پور کے نواب ہوئے ڈپٹی کلکٹر تھے، یہ دورہ مجاہدین کی بھرتی کے لیے کیا گیا تھا، مومن خاں خود تو جہاد میں شریک نہ ہوسکے لیکن جو کوشش میدان جنگ سے باہر رہ کر وہ کرسکتے تھے، اس میں کمی نہیں کی''۔ (رضا لائبریری جرنل، رام پور، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۵)

مومن کے ''سفر سہوان'' سے یہاں کی شعری فضا پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کے بارے میں کچھ لکھنا ناممکن ہے، مومن کا یہ سفر غالب کے خلاف فضا بنانے کا محرک بنا، یہ بھی بنیادی بات معلوم ہوتی ہے، البتہ مومن کے اس سفر سے شعرا، علما و حکمائے سہوان کا مومن سے زیادہ بہتر طور پر تعلق استوار ہونا اور نتیجے کے طور پر مومن کو یہاں، عمومی طور پر پسند کیا جانا، قرین

قیاس معلوم ہوتا ہے۔

الغرض رد غالب کی بنیاد سہسوان میں رکھی گئی، اس کا امکان ہے کہ غالب شکنی کا سبب علما، شعرا و حکمائے سہسوان کا غیر مقلد ہونا بھی ہو، غالب مایل بہ شیعیت تھے اور سلفی مسلک کے پیروکاروں میں شیعیت یا دوسرے مسلک والوں کے لیے نرم گوشہ نہیں ہے، لیکن اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

غالب کے مخالفین میں ایک نام علی بخش خاں شرر کا بھی ہے، شرر ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے اور یہیں ۲ مئی ۱۸۸۵ء کو وفات پائی، عربی و فارسی ادبیات کے منتہی تھے، سرکاری ملازمت بھی کی اور صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے، فن مناظرہ میں ماہر سمجھے جاتے تھے، سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کے مذہبی افکار کے رد میں تین رسالے باسم شہاب ثاقب، تائید الاسلام، موید الاسلام (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۷۳ء) لکھے اور سرسید سے ایک عرصے تک پندرہ روزہ منشور محمدی (بنگلور) نور الآفاق (کان پور) نور الانوار (کان پور) وغیرہ کے صفحات پر تحریری مناظرے کیے، سرسید نے ان کا دل جیتنے کے لیے خزینۃ البضاعۃ کمیٹی کی ایک میٹنگ کی اور مذہبی تعلیم کی نگراں کمیٹی کو از سر نو تشکیل دیا، نئی کمیٹی کا کنوینر مولوی علی بخش کو بنایا، علاوہ مذکورہ صدر تین رسایل کے دیوان شرر (آگرہ ۱۸۵۲ء)، تنقیح المسائل، قاعدۃ التدریس کتب بھی شایع ہوئیں، بہ حیثیت شاعر تذکرہ نادر و خمخانہ جاوید میں ان کا ترجمہ شامل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: شعرائے بدایوں-دربار رسول میں، ص ۵۵ تا ۵۹)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مضمون "غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ" میں شرر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور انہیں غالب کے مدمقابل کے طور پر متعارف کرایا ہے، انہوں نے لکھا ہے:

"(شرر) خود کو غالب کا مدمقابل سمجھتے تھے اور ان کے جواب میں ہم ردیف و ہم قافیہ غزلیں لکھتے تھے"۔ (غالب اور عصر غالب، ص ۸۹)

ضیاء القادری نے لکھا ہے:

"مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی"۔ (اکمل التاریخ،



ج ۱، ص ۲۶)

ڈاکٹر ایوب قادری نے مولف اکمل التاریخ سے جب اس اجمال کی شرح چاہی تو انہوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۳ فروری ۱۹۶۹ء میں ایوب قادری کو تحریر فرمایا:

"اکمل التاریخ کو چھپے ہوئے پچپن سال کے قریب ہوگئے، اب مجھے کوئی تفصیل یاد نہیں ہے، کتاب لکھنے کے زمانہ میں مدرسہ قادریہ کا سارا کتب خانہ میرے سامنے تھا، مولوی علی بخش خاں مرحوم و مغفور کے خاندان کے ذخائر تک بھی رسائی تھی، کچھ قلمی مواد مولوی حامد بخش مرحوم اور مولوی سراج الحق صاحب کے یہاں بھی تھا، اس ذخیرے میں کہیں یہ بات بھی لکھی تھی کہ مرزا غالب اور مولوی علی بخش شرر سے شعر و شاعری میں چشمک اور چھیڑ چھاڑ رہتی تھی، میں نے متعدد غزلیں غالب کی زمین میں ان کے دیوان میں دیکھی تھیں، ان کا مطبوعہ دیوان میرے سامنے رہا تھا"۔ (غالب اور عصر غالب، ص ۸۸)

پروفیسر آل احمد سرور جن کے پیش نظر علی بخش خاں شرر کی قلمی بیاض رہی ہے اور جو خود بھی اسی خانوادے کے فرد تھے، انہوں نے شرر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ بات قابل غور ہے کہ اکثر غزلوں پر ہم طرح غزلیں ملتی ہیں، مصنف اکمل التاریخ نے لکھا ہے کہ "مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی"، اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مل سکتا...... مگر غالب کی غزلوں سے بہت پھیکی ہیں، ان میں ذوق کا رنگ زیادہ ہے"۔ (نئے اور پرانے چراغ، ص ۱۲۶)

غالب کے قطعہ بند اشعار جو چکنی ڈلی سے متعلق ہیں، اسی زمین میں شرر نے بھی پچوان کی رسید میں ایک قطعہ لکھا جو دیوان شرر (آگرہ ۱۸۵۲ء) سے اخذ کر کے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیوان غالب اردو (نسخہ عرشی) میں نقل کیا ہے۔

غالب اور شرر کے مابین اس ادبی چشمک کی مزید تفصیل اور نوعیت کا علم نہیں ہوسکا، اب رہے غالب کے مداح و معترف تو ان میں ہمیں دو نام ملتے ہیں:

۱- منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی۔ ۲- شاہ دلدار علی مذاق بدایونی۔

تسلیم سہوانی (۲۹ر جون 1815ء-۹ر مئی ۱۸۹۲ء) کی سہوان میں تعلیم وتربیت ہوئی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد مرادآباد میں امین کے عہدے پر مامور رہے، بعدازاں نواب رام پور کے دربار سے وابستہ ہوگئے، وہاں سے لکھنؤ پہنچے اور نول کشور پریس میں اردو وفارسی کتب کی صحت کا کام ان کے سپرد ہوا، "اودھ اخبار" لکھنؤ کی ادارت کے فرایض بھی انجام دیے، تصنیف وتالیف سے بھی شغف تھا، فن تاریخ گوئی پر ملخص تسلیم (مرادآباد ۱۸۹۶ء) علم بیان وبدیع میں تاج المدائح (لکھنؤ ۱۹۲۸ء) اور بعض دوسری کتب یادگار ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں، انوار حسین تسلیم سہوانی، از: حنیف نقوی، آج کل، دہلی، نومبر ۱۹۵۸ء)

تسلیم نے اپنی کتاب ملخص تسلیم میں غالب کا دوجگہ تعریف وتوصیف کے ساتھ ذکر کیا ہے، غالب کا آٹھ شعر پر مشتمل ایک تاریخی قطعہ جو محسن لکھنوی کے تذکرہ سراپا سخن (طبع اول ۱۲۷۷ھ/ ۶۱-۱۸۶۰ء) کے لیے لکھا گیا تھا اور جو اس تذکرے کے صفحہ ۳۹۳ پر درج ہے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (ملہم التاریخ، ص ۷۱، اردو ترجمہ ملخص تسلیم)، دوسری جگہ جلال لکھنوی (ف ۱۹۰۹ء) کے رسالہ "افادہ تاریخ" پر نقد کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے:

"اسی حالت بے اختیاری میں جو تالیف کتاب کے وقت طاری تھی غالب وصہبائی کو بہت برا کہا ہے، یہ وہی تعصب ہے جو بعض لکھنویوں کو دہلویوں سے ہوتا ہے، افسوس کہ یہ مرض لاعلاج ہے، حالاں کہ غالب ہند میں اپنی نظیر آپ تھا"۔ (ملہم التاریخ، اردو ترجمہ ملخص تسلیم، ص ۷۵)

راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں "قاطع برہان" کا جواب لکھنے والوں میں تسلیم کو شامل کیا تھا (دید و دریافت، ص ۲۳) لیکن مذکورہ صدر رائے رکھنے والا قاطع برہان کا جواب لکھنے والوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

تسلیم کے صہبائی سے خاص مراسم تھے، غالب سے مراسم کا علم نہیں۔ لیکن مرزا غالب جب پہلی مرتبہ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء میں رام پور آئے تو اثنائے سفر مرادآباد میں بھی رکے، یہیں پر ان کی ملاقات تسلیم سہوانی سے ہوئی، سہ ماہی العلم کراچی (اپریل تا جون ۱۹۷۱ء) میں تسلیم کے شاگرد پر ایک مضمون بہ عنوان "مرزا احمد شاد بیگ جوہر شاگرد تسلیم" شایع ہوا، مضمون نگار نے اطلاع دی:



"حضرت غالب رام پور جاتے ہوئے مرزا مدارا بیگ کے یہاں مرادآباد میں فروکش ہوئے، منشی صاحب مرحوم (مراد تسلیم) ملنے گئے تو انہوں نے اپنی آمد کی تاریخ کی فرمایش کی، آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

قادر سخنورے آمد...... ۱۲۷۶ھ"۔ (ص ۱۱۶)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے غالب اور تسلیم کی ملاقات کا مذکورہ صدر حوالے سے ذکر کرتے ہوئے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"رام پور کے دوران سفر میں مرزا مرادآباد میں ٹھہرے تھے، مرزا لکھتے ہیں۔ "بعد روانگی کے مرادآباد پہنچ کر بیمار ہوگیا، پانچ دن صدر الصدور صاحب کے یہاں پڑا رہا، انہوں نے تیمارداری اور غم خواری کی" (خطوط غالب حصہ اول، ص ۲۱۷)۔ یہ صدر الصدور مولوی محمد حسن خاں بریلوی المتخلص بہ اسیر (وفات تقریباً ۱۸۷۳ء) تھے جو اس زمانے میں وہاں صدر الصدور تھے، اسیر اور غالب سے خاصے تعلقات تھے"۔ (غالب اور عصر غالب، ص ۱۷۹)

ڈاکٹر قادری غالب کے دوسرے سفر رام پور (۱۸۶۵ء) کو پہلے سفر رام پور (۱۸۶۰ء) سے متعلق کردیا ہے۔

مرزا پہلے سفر رام پور میں دہلی سے رام پور آتے ہوئے مرادآباد میں فروکش ہوئے تھے اور دوسرے سفر رام پور (۱۸۶۵ء) میں رام پور سے دہلی جاتے ہوئے مرادآباد میں پانچ دن قیام کیا تھا، لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ یہ قیام دوران سفر ایک حادثہ پیش آجانے کے سبب تھا، (حادثہ کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: ذکر غالب، ص ۹۶-۹۷) مرزا اس حادثے سے بچ کر مرادآباد پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور ایک مقامی سرائے میں رات بسر کی، اگلی صبح محمد حسن خاں اسیر (ف ۱۸۷۳ء) صدر الصدور انہیں اپنے گھر لے گئے، مرزا نے وہاں پانچ دن قیام کیا، مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط مورخہ جنوری ۱۸۶۶ء میں غالب نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، نواب کلب علی خاں کے نام خط نمبر ۱۶، مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۸۶۶ء میں بھی انہوں نے اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے اسیر کے یہاں قیام کا تذکرہ کیا ہے۔ (غالب کے خطوط، ج ۳، ص ۱۲۲۱)

مولانا حالی نے حیات جاوید (حاشیہ ص ۷۵) میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حالی کے حوالے سے تلاش غالب (ص ۵۵) میں صدر الصدور سے مراد سرسید احمد خاں لئے ہیں، اور غالب کا پانچ روزہ قیام مرادآباد سرسید کے یہاں دکھایا ہے، لیکن نواب کلب علی خاں کے نام حوالہ بالا خط میں صدر الصدور کے نام (مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور) کے اعلان و اندراج کے بعد مولانا حالی اور فاروقی صاحب کے بیانات غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔

محمد حسن خاں اسیر، غالب کے شاگرد مفتی سلطان حسن خاں، احسن (ف ۱۸۸۲ء) کے حقیقی چچا تھے، ان دونوں کا تعلق بدایوں کے علماء کے عثمانی خاندان سے تھا، غالب کے معروف شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) بھی عثمانی خاندان ہی کے فرد تھے، لیکن بزرگوں کے بریلی میں متوطن ہوجانے کے سبب یہ بھی بریلوی مشہور ہوگئے، محمد حسن خاں اسیر اور جنون کا خاندان مفتی درویش محمد (ف ۱۷۶۹ء) کی اولاد میں تھا، جن کا شجرۂ نسب بدایوں کے عثمانی علما کی خاندانی تاریخ اکمل التاریخ (ج ۱ ص ۳۰) میں مع ترجمہ درج ہے۔

اسیر کے والد مولوی ابوالحسن، حسن عدالت محکمہ افتاء بریلی میں فائز تھے، صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے، انہوں نے مستقل طور پر بریلی میں سکونت اختیار کرلی تھی، اسیر کا مولد بدایوں تھا یا بریلی اس کے متعلق علم نہیں، البتہ وہ بریلی ہی میں رہے، ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے وہ بھی صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے، منصب افتاء پر فائز رہنے کے سبب بریلی میں یہ لوگ مفتی کہلائے اور ان کا خاندان ''خاندان مفتیان'' کے نام سے موسوم ہوا۔

اسیر کا شمار عثمانی خاندان کے علما میں تھا، باوجود ملازمت کے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا بھی مشغلہ جاری رہا، اردو وفارسی دونوں میں شعر کہتے تھے، مختلف علوم پر متعدد کتب یادگار ہیں، (اکمل التاریخ ج ۱ ص ۴۳) فارسی و اردو کلام کا مجموعہ ''چمنستان سخن'' (مطبع رفاہ عام، گورکھپور ۱۹۰۸ء) شایع ہوچکا ہے، اسیر نے غالب کی وفات پر ایک قطعہ کہا تھا، جو حسب ذیل ہے:

غالب کہ بود پیر مغان سخنوری　　زیں دہر چو بدار سلامت گرفت آہ
ساغر شکست و میکدہ شعر شد خراب　　مینا گریست زار کہ غالب بمرد آہ
۱۲۸۵ھ



(چمنستان سخن ص: ۲۱ بحوالہ غالب اور عصر غالب ص ۲۴۲)

اسیر اور غالب کے تعلق کی مزید وضاحت نہیں ہوسکی ہے، اسیر کی علمی حیثیت، دنیاوی منصب اور خاندانی عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ امکان بعید از قیاس نہیں کہ وہ غالب کے مکتوب الیہ بھی رہے ہوں۔

غالب کے بدایونی مداحوں میں دوسرا نام شاہ محمد دلدار علی مذاق بدایونی (۲۹ دسمبر ۱۸۱۹ء - ۱۱/اکتوبر ۱۸۹۶ء) کا ہے، جو ذوق دہلوی (ف ۱۸۵۴ء) کے ممتاز شاگرد تھے، مذاق ۱۸۳۶ء میں ذوق کے شاگرد ہوئے، صوفی منش انسان تھے، ذکر وشغل میں مشائخانہ زندگی بسر کرتے تھے، سیر وسیاحت بھی کی، مذاق کا بوجہ تلمذ محمد ابراہیم ذوق اور زیارت بزرگان دین کا اکثر دہلی آنا جانا رہتا تھا، جہاں وہ صاحبان علم وادب سے بھی ملاقات کرتے ہوں گے، ان کے پوتے اور سوانح نگار ابرار علی صدیقی نے لکھا ہے:

''دہلی میں استاد ذوق کے ساتھ شہر اور قلعہ کے شاعروں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا، اس کے علاوہ مومن اور غالب کی صحبتیں اٹھائیں جب کبھی دہلی جانا ہوتا ان سے ضرور ملنے جاتے، یہ دونوں حضرات بھی آپ سے خصوصی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، چنانچہ آپ ان پرخلوص ملاقاتوں کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:

ناسخ و آتش ہے نہ ذوق و نصیر　　مومن و غالب کی وہ سنگت نہیں
کیوں کہ ہو یاروں سے اب صحبت برار　　اگلے سے وہ یار وہ صحبت نہیں
(آئینۂ دلدار ص ۱۳۶)

مرزا غالب نے مذاق کے اس شعر کے بقول ابرار علی صدیقی کی بے حد تعریف فرمائی:

مرتے ہیں ہر لب جاں بخش پر　　ہم کو تو مرنے کی بھی فرصت نہیں

ابرار علی نے مذاق کے احباب میں من جملہ مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۸۶۱ء) مفتی صدر الدین آزردہ (ف ۱۸۶۸ء) مولانا فیض الحسن ادیب (ف ۱۸۸۷ء) مومن خاں مومن (ف ۱۸۵۲ء) مولانا محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء) وغیرہم کے مرزا غالب کا نام بھی درج کیا ہے، (ص ۷۶) غالب اور مذاق کے مابین احباب جیسا ربط وتعلق تھا، کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میرے خیال میں یہ تعلق خورد اور بزرگ ہی کا رہا ہوگا، جیسا کہ غالب

کے فارسی خط بنام مفتی سید احمد خاں سیدؔ (ف ۱۸۵۹ء) سے ظاہر ہے، جس میں غالب، مذاق بدایونی کا نام محبت کے ساتھ درج کرتے ہیں مگر مشفقی اور سلمہ اللہ کے اضافے کے ساتھ (آئینہ دلدار ص ۹۲ - ۹۳) یہ ایک طویل خط ہے جو غالب کے فارسی مکتوبات میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، صاحب آئینہ دلدار نے ملفوظات، طیبات، مذاق میاں (مرتبہ اخبار علی بدایونی، مطبوعہ امیر الاقبال پریس، بدایوں، سال اشاعت ندارد) سے اخذ کرکے اسے شامل سوانح کیا ہے (ص ۹۱:۹۲) اس خط کے مضمون کے پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"مفتی سید احمد خاں صاحب بریلوی نے ایک مرتبہ اپنے استاد مرزا غالب کو خط لکھا جس میں اصلاح کے لئے کچھ غزلیں وغیرہ بھی ارسال کی تھیں، اتفاق سے خط لکھتے وقت مذاق میاں بھی وہاں موجود تھے، بر بنائے تعلقات آپ نے (مراد مذاق میاں) مرزا صاحب کو سلام لکھوا دیا، مرزا غالب اس زمانے میں نہایت عدیم الفرصت تھے، کیوں کہ وہ "تاریخ فرمانروائے خاندان تیموریہ" کی ترتیب و تالیف میں بے حد منہمک تھے، اس کے جواب میں تاخیر ہوئی، بالآخر مرزا صاحب نے سید صاحب کو اس تاکید کے ساتھ خط لکھا کہ تم میاں مذاق سے مشورہ سخن کیوں نہیں کرتے اور آخر میں مذاق میاں کو مشفقانہ انداز میں سلام بھی لکھا"۔

(آئینہ دلدار ص ۱۲۸، ۱۲۹)

اس خط کی وہ عبارت جو مذاق میاں سے متعلق ہے حسب ذیل ہے:

"دل بہ نثر آنچناں بستہ ام کہ بہ نظم توانم پرداخت مشفقی مولوی محمد دلدار علی صاحب مذاق کہ بدانست بندہ در معنی آفرینی با سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق برابر و بہ اعتقاد خویش شاگرد آں دیرینہ سخنور اند، آخر نہ ہمدم و ہم نشیں آں والا گہر اند چرا باایشاں در سخن مشورت نزدو، مشورت در سخن ننگ نیست، غلط کاران استادی و شاگردی را دور بردہ اند، نزد بندہ ہم زمانے و ہم نفسے پیش نیست، نامہ نگار شاگردان خویش را ہمدم و ہم رازی شمرد و ہرگز بچشم کم دراناں نمی نگرد، اوستاد چرا با خود شاگرد چرا فروتنی کند ہر کہ در راہ دو گام از خود پیش است رہنما بودنش بجائے خویش است ........



مشفقی مولوی محمد دلدار علی صاحب مذاق سلمہ اللہ تعالی سلام خوانند والسلام مع ...... الاکرام"۔ از اسد اللہ نگارشتہ پنجشنبہ سوم اکتوبر ۱۸۵۰ء (آئینہ دلدار ص ۹۲، ۹۳)

مذکورہ صدر اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالب کی نظر میں مذاق کی کیا اہمیت تھی، ابرار علی صدیقی نے غالب سے مذاق کی ملاقات کا ایک واقعہ بھی درج کیا ہے، جو ظاہر ہے خاندانی روایت پر مبنی ہے، لیکن ابرار علی نے جس احتیاط، سلیقے اور حوالوں کے ساتھ ان کی سوانح مرتب کی ہے اس سے غلط بیانی کا کوئی ظاہری امکان نظر نہیں آتا، واقعہ حسب ذیل ہے، ابرار علی نے لکھا ہے:

"ایک دفعہ مذاق میاں صاحب کا دہلی جانا ہوا تو حسب معمول مرزا غالب کے یہاں بھی گئے، دروازے پر پہنچ کر دستک دی، اس وقت وہاں آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا، مرزا غالب کے بعض احباب اور شاگرد بھی موجود تھے، اور وہ ان لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ "استاد ذوق کو تو بنا بنایا شاگرد ہاتھ آگیا" غرض اجازت پاکر آپ اندر مکان میں داخل ہوئے مرزا غالب نے آپ کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور حسب عادت محبت آمیز انداز میں آپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "بھتیجے تمہارے سر کے بالوں کو دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے" مذاق میاں کی عمر اس وقت تقریباً ۲۲، ۲۳ سال کی تھی، سر پر گھنے گھونگریالے بال تھے، جو بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے، الغرض آپ نے ادب کے ساتھ جواب دیا کہ "چچا بال تو میرے سر پر اور وحشت آپ کو ہوتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آیا" مرزا غالب اس جواب سے بہت خوش اور محظوظ ہوئے، پھر مسکراتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا "میاں سنو! ہم نے گیسو، ببریاں اور کاکل رکھے، اس کے بعد اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا مگر جو منڈے سر میں آرام ہے وہ کسی حال میں نہیں"۔ (آئینہ دلدار ص ۱۲۸)

مذاق کی پیدائش ۱۹ر دسمبر ۱۸۱۹ء کو ہوئی، غالب سے ملاقات کے ایام میں ان کی عمر تخمیناً ۲۱، ۲۲ سال درج کی گئی ہے، اس اعتبار سے یہ ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کا واقعہ قرار پاتا ہے، غور طلب یہ بھی ہے کیا اس وقت مرزا نے اپنے سر کے بال منڈوائے تھے، مالک رام نے لکھا ہے:

"جوانی میں داڑھی منڈاتے اور سر پر پٹھے رکھتے تھے، جب کہولت کا زمانہ

آیا اور داڑھی مونچھ میں سپید بال آگئے تو داڑھی منڈانا ترک کردی ...... جس دن داڑھی بڑھائی اسی دن سر منڈایا"۔ (ذکر غالب ص ۱۵۷، ۱۵۸)

گویا اس ملاقات کے وقت مرزا کی عمر کم وبیش ۴۵، ۴۶ سال کی رہی ہوگی، اور اس عمر میں مرزا نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے آئینہ دلدار اور شعرائے بدایوں۔ دربار رسول میں ص ۷۲ تا ۷۸)

غالب کے وہ معاصرین اور تلامذہ جو بدایوں یا اطراف بدایوں سے تعلق رکھتے تھے ان کی غالب سے متعلق کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گذری، گمان ہے غالب کی وفات پر تاریخی قطعات کہے گئے ہوں گے، مرثیے بھی لکھے گئے ہوں گے لیکن یہ بات ہمارے علم و اطلاع میں نہیں ہے، غالب کے ایک معاصر ادیب منشی دیبی پرشاد سحر (ف ۱۹۰۲ء) کے تین قطعات ملتے ہیں جو ان کے دیوان "دیوان سحر" ملقب بہ سحر سامری (مطبوع نول کشور پریس لکھنؤ ستمبر ۱۸۸۱ء) میں شامل ہیں، قطعات حسب ذیل ہیں:

حیف کہ غالب ز جہاں رفت بست　　بود یکے شاعر با حلم و فضل

مرد چو او ایں ہمہ بے جان شدند　　شعر و سخن، نثر و ہنر، علم و فضل

۵۰۰+۱۱۰+۲۵۰+۲۰۵+۱۱۰+۱۱۰ = ۱۲۸۵ھ

آخری مصرعہ میں مستعمل ہر لفظ شعر، سخن، نثر، ہنر، علم، فضل میں ہر ایک لفظ کے بیچ کا حرف (مثلاً شعر میں ع، سخن میں خ، وغیرہ) کے اعداد ساقط کئے جائیں گے اور واؤ عطف کا عدد بھی شمار نہیں ہوگا، تب سنہ برآمد ہو سکے گا۔

تھا شاعر نامی یہی اب دنیا میں　　افسوس یہ ہے کہ مرگیا غالب بھی

ہے سحر یہ مصرعہ مرے لب پر جاری　　دنیا سے آج چل بسا غالب بھی

۱۲۸۵ھ

---

مرگیا غالب جو لافانی تھا شاعر ہند میں　　لے گیا دنیائے دوں سے حسرتیں کیا کیا دریغ

فکر میں اے سحر میں بیٹھا ہوا تھا ناگہاں　　یہ ندا آئی فلک سے "وائے واویلا دریغ"

۱۲۸۵ھ

(سحر سامری ص ۷۲)



## کتابیات


۱۔ اکمل التاریخ ج ۱، ۲ محمد یعقوب ضیاء القادری، مطبع قادری، بدایوں، ۱۹۱۵، ۱۹۱۶ء

۲۔ آئینہ دلدار، ابرار علی صدیقی، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۵۶ء

۳۔ تلاش غالب، پروفیسر نثار احمد فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۹۹ء

۴۔ حیٰوۃ العلما، سید محمد عبدالباقی سہسوانی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۲ء

۵۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۹۰ء

۶۔ حیات مومن، ضمیر الدین احمد عرش، تجلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء

۷۔ خوش معرکہ زیبا ج ۲، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء

۸۔ دید و دریافت، شمس بدایونی، روشن پبلی کیشنز، بدایوں، ۱۹۸۱ء

۹۔ دیوان شرر، علی بخش خاں شرر، اسعد الاخبار، آگرہ، ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء

۱۰۔ دیوان غالب، (نسخہ عرشی) مولانا عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۲ء

۱۱۔ ذکر غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۵۰ء

۱۲۔ سحر سامری، دیبی پرشاد سحر، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۱ء

۱۳۔ شعرائے بدایوں دربار رسول میں، شمس بدایونی، ڈان پرنٹنگ پریس، کراچی، بار دوم، ۱۹۹۷ء

۱۴۔ غالب کے خطوط ج ۴، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۳ء

۱۵۔ غالب اور عصر غالب، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۶۔ کلیات مومن، مومن خاں مومن، رام نرائن بنی مادھو، الہ آباد، ۱۹۷۱ء

۱۷۔ مومن شخصیت اور فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱۸۔ نئے اور پرانے چراغ، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

۱۹۔ ذوالقرنین (بدایوں نمبر)، مرتبہ وحید الدین نظامی، نظامی پریس، بدایوں، اپریل ۱۹۵۶ء

۲۰۔ رضا لائبریری جرنل، رام پور، شمارہ ۲۵، ۱۹۹۵ء

۲۱۔ رہنمائے تعلیم، دہلی، فروری ۱۹۸۲ء

# ہندوستان کی مطبوعہ
# عربی تصانیفِ سیرت اور ان کے مصنفین

از:- توقیر احمد ندوی ☆

(۲)

فن سیرت نگاری میں گیارہویں صدی ہجری زیادہ ممتاز ہے، اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ کمیت و کیفیت ہر لحاظ سے اہم ہیں، بارہویں صدی ہجری میں بھی اس فن نے ارتقائی منزلیں طے کی، مگر گیارہویں صدی کی طرح اس میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی، اس صدی کے جن سیرت نگاروں کے نام معلوم ہو سکے ہیں ان کے حالات اور علمی کارناموں کا مختصر مرقع پیش کیا جاتا ہے۔

## شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ)

شیخ یعقوب بن حسن صرفی کشمیری ۹۰۸ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد دیگر علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا رضی الدین کشمیری، نصیر الدین امی اور محمد آنی وغیرہ سے نحو و صرف، فقہ و منطق اور حکمت و معانی وغیرہ کی تعلیم پائی، مزید تحصیل علم کے لئے سمرقند کا سفر کیا جہاں شیخ حسین خوارزمی سے فیض یاب ہوئے، پھر کشمیر آئے، یہیں سے حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور یہاں کے علما میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی کے درس حدیث میں شامل ہوئے، وہاں سے بغداد کا سفر کیا اور یہاں کے مشائخ سے بھی کسب فیض کیا، کچھ دنوں بعد دوبارہ سفر حج پر روانہ ہوئے اور

☆ رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ



واپس آکر درس و تدریس اور افادۂ علم میں مصروف ہوئے، واپسی میں حدیث و فقہ اور تفسیر وغیرہ کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے اور انہیں یہاں پر عام کیا، ان سے استفادہ کرنے والوں میں طریقہ مجددیہ کے امام احمد بن عبد الاحد سرہندی بھی ہیں، ان کی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی (۱)۔

شیخ یعقوب صرفی کی تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں، تفسیر قرآن (نامکمل)، شرح بخاری، مسلک الاخیار، مثنوی وامق و عذرا، مثنوی لیلی و مجنوں، مناسک حج، حاشیہ توضیح تلویح، حاشیہ روائح وغیرہ اور سیرت پاکؐ کے موضوع پر مغازی النبوۃ کے نام سے ایک کتاب ہے۔

## شیخ طاہر سندھی (م ۱۰۰۴ھ)

طاہر بن یوسف بن رکن الدین محدث فقیہ اور ممتاز عالم تھے، یہ ابن شہاب الدین سندھی کے نام سے مشہور ہوئے، سندھ کے پاتری گاؤں میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن ہی میں والدین کے ساتھ گاؤں چھوڑ دیا تھا، شیخ شہاب الدین سندھی سے امام غزالی کی منہاج العابدین پڑھی، ۹۵۰ھ میں گجرات جا کر مولانا عبد الاول بن علی حسینی جون پوری (م ۹۶۸ھ) سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور محمد غوث گوالیاری سے طریقت و سلوک سیکھا، بیدر (احمد آباد) میں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے، مگر احمد آباد میں بھی مستقل قیام نہ کر سکے اور برہان پور تشریف لائے، جہاں ۱۰۰۴ھ میں انتقال ہوا (۲)۔

متعدد کتابیں تالیف کیں، تفسیر قرآن میں مجمع البحرین، تلخیص قوت القلوب (مکمل) اور مختصر تفسیر المدارات لکھی، کرمانی کی شرح اسماء رجال البخاری کی تلخیص بھی کی تھی، سیرت نبویؐ میں قسطلانی کی مواہب لدنیہ کا ایک منتخب تیار کیا، ان کی زیادہ اہم تصنیف ریاض الصالحین ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے، اول میں صحیح احادیث کا انتخاب ہے، دوسرے میں کبار صوفیہ عبد القادر جیلانی امام غزالی، ابوطالب مکی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ زین الدین اور شیخ علی بن حسام الدین متقی وغیرہ کے مقالات شامل ہیں اور تیسرے حصہ میں وحدت الوجود کے متعلق شیخ محی الدین بن عربی، ش عین القضاۃ ہمدانی اور شیخ صدر الدین قونوی کے ملفوظات قلم بند کئے ہیں۔

(۱) سبحۃ المرجان ۱/۱۲۴ (حاشیہ)، نزہۃ الخواطر ۵/۴۳۹ (۲) نزہۃ الخواطر ۵/۱۸۶

## شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری (۱۰۱۱ھ)

شیخ منور بن عبدالحمید بن عبدالشکور لاہوری علوم عقلیہ ونقلیہ کے ممتاز عالم تھے، ان کے اساتذہ میں صرف سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری کا نام ملتا ہے۔

مولانا منور قوی الحافظہ اور زود فہم تھے، بیس سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے جس میں ساتوں قرأت سے واقفیت بھی شامل ہے، اکبر بادشاہ کے منظور نظر تھے، اس نے ۹۸۵ھ میں ان کو مالوہ کے عہدۂ صدارت پر فائز کیا تھا، جس پر دس سال تک برقرار رہے، مگر کسی بات پر اکبر خفا ہو گیا اور ۹۹۵ھ میں ان کی معزولی کے ساتھ ساتھ قید کا بھی حکم دیا، مگر قید و بند میں بھی وہ تحریر و تصنیف میں مشغول رہے اور ''الدر النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم'' تصنیف کی، اس کے علاوہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی البحر المواج پر بھی کام کیا، اکبر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ان کے تمام مال واسباب ضبط کر لینے اور گوالیار کے قلعے میں قید بامشقت کا فرمان جاری کیا، مال واسباب کے ساتھ ان کی ڈیڑھ ہزار کتابیں بھی چلی گئیں مگر اول الذکر کتاب کسی طرح بچ گئی، قید و بند ہی میں ۱۰۱۱ھ میں وفات ہوئی اور غربا کے قبرستان میں دفن کیے گئے، لیکن چار سال بعد ۱۰۱۵ھ میں ان کی اولاد نے انہیں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا (۱)

شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری کی کتابوں کے موضوعات مختلف ہیں، مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ حدایق البیان (بدیع البیان کی شرح)، شرح الطوالع، الحق الصریح، شرح ارشاد (قاضی شہاب الدین)، شرح مشارق الانوار (صنعانی) اور شرح قصیدہ بردہ (بوصیری) وغیرہ بھی ان کی تصانیف ہیں۔

## شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ)

محمد بن فضل اللہ بن صدر الدین جون پوری برہان پوری، گجرات میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلہ نسب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔

(۱) نزھۃ الخواطر ۵ / ۴۱۲، علمائے ہند کا شاندار ماضی، مولانا محمد میاں دیوبندی، رشیدیہ پریس دہلی ۱۹۴۶ء، ۱ / ۴۴۷



ابتدائی تعلیم گجرات میں شیخ صفی گجراتی کی خدمت میں رہ کر حاصل کی، پھر حرمین شریفین گئے، وہاں بارہ سال تک قیام کیا اور علی بن حسام الدین متقی مکی سے کسب فیض کے بعد احمد آباد واپس آئے، شیخ وجیہہ الدین بن نصر اللہ علوی، شیخ محمد ماہ بیر پوری اور شیخ ابو محمد بن خضر تمیمی وغیرہ سے علوم کی تکمیل کی، برہان پور میں مستقل سکونت اختیار کر کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے، یہ بڑے عبادت گزار اور خدا ترس شخص تھے، ۱۰۲۹ھ میں وہیں وفات ہوئی۔

انہوں نے شرح اللوائح (للجامی) اور ایک رسالہ امرد کی کراہیت امامت پر لکھا اور سیرت پاک ﷺ پر چار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں: ۱۔ الھدیۃ المرسلۃ الی النبی ﷺ ۲۔ الوسیلۃ الی شفاعۃ النبی ﷺ ۳۔ الشمایل للترمذی ۴۔ ایک رسالہ معراج نبوی ﷺ، الوسیلۃ قاضی عیاض کی الشفا کی تلخیص وتہذیب ہے، الشمائل پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے (۱)

## شیخ عبدالقادر عیدروس حضرمی (م ۱۰۳۸ھ)

شیخ عبدالقادر بن شیخ عبداللہ عیدروس حضرمی کی کنیت ابوبکر اور محی الدین لقب تھا، یہ عالم، فاضل، صوفی، شاعر اور مؤرخ تھے، ۹۷۸ھ میں احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے اپنی تعلیمی سفر کی ابتدا حفظ قرآن سے کی، اس کے بعد دیگر کی طرف متوجہ ہوئے، جس کے لئے دور دراز کا سفر بھی کیا، خود ان کے والد کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، اس کے باوجود شوق علم میں مختلف مقامات کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، جس سے ان کے علم میں بڑی وسعت پیدا ہوئی اپنے والد کے علاوہ شیخ حاتم بن احمد اھدل، شیخ عبداللہ بن سید شیخ عیدروس، شیخ درویش حسین کشمیری، شیخ موسیٰ بن جعفر کشمیری اور شیخ محمد بن حسن چشتی، گجراتی وغیرہ سے کسب فیض کیا۔

یہ اپنے علم وفضل، تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف کی وجہ سے ہر طبقے میں یکساں مقبول تھے، امرا اور روسا بھی ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، شیخ عیدروس اچھے شاعر بھی تھے، مگر شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، ان کا ایک مجموعۂ کلام ''الروض الاریض والفیض المستفیض'' بھی ہے، شیخ سے مستفید ہونے والوں کی کثیر تعداد ہے جن میں بہت سے اپنے

(۱) نزھۃ الخواطر ۵ / ۵۲، ۳ معجم المولفین ۱۱ / ۱۳۰۔

وقت کے مشاہیر علما میں شمار کئے جاتے تھے، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں، سید جمال الدین محمد بن یحییٰ شامی مکی، شیخ بدر الدین حسن بن داؤد کوکنی ہندی، فقیہ شیخ محمد بن عبدالرحیم تاجابر حضرموتی اور شیخ شہاب الدین احمد بن احمد بن ربیع بن احمد سنباطی مکی وغیرہ، انہوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی ۱۰۳۸ھ میں احمد آباد میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

ان کی تصانیف میں النور السافر فی اخبار القرن العاشر، الفتوحات القدسیہ، منح الباری بختم صحیح البخاری، تعریف الاحبا لفضائل الانبیا، بغیة المستفید بشرح تحفة المرید، الحواشی الرشیقة علی العروة الوثیقة، اتحاف اخوان الصفا، الفتوحات القدوسیة فی الخرقة العد روسیة، الدر الثمین فی بیان المهم من الدین اور قرة العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین وغیرہ متعدد اہم اور مفید کتابیں ہیں، انہوں نے سیرت پاک ﷺ کے موضوع پر اپنے چار شاہ کار یادگار چھوڑے ہیں،

۱۔" الحدائق الخضرة فی سیرة النبی ﷺ واصحابه العشرة ۲۔اتحاف الحضرة العزیزة بعیون السیرة الوجیزة ۳۔المنتخب المصطفی فی اخبار مولد المصطفی ۴۔المنهاج الی معرفة المعراج (۱)

الحدائق الخضرة ان کی سب سے پہلی مستقل کتاب ہے، جس کو انہوں نے بیس سال کی عمر میں لکھا، اس میں اور اتحاف الحضر ة..... میں سیرت نبویؐ کے علاوہ عشرہ مبشرہ اور دیگر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، موخر الذکر کتاب دو حصوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں چار ابواب ہیں ان میں آپ کی حیات طیبہ بیان کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں دس ابواب ہیں، ان میں عشرہ مبشرہ کے مختصر حالات درج ہیں اور خاتمہ میں اصحاب رسول ﷺ کے اوصاف وفضائل قلم بند کیے گئے ہیں، المنتخب المصطفی (۲) میں مولد النبی

(۱) نزہۃ الخواطر ۵/ ۵۲۳، عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ ص ۳۹۱، معجم المولفین ۵/ ۲۸۸۔ (۲) ڈاکٹر زبیر احمد نے اس کا نام مولد النبی تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اور المنتخب المصطفی دونوں ایک ہی کتاب ہے جو درست ہے کیوں کہ دونوں ہی ولادت باسعادت کے بیان میں ہیں جو خود نام سے بھی ظاہر ہے، ڈاکٹر صاحب نے مولد النبی نام لکھا ہے اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے المنتخب المصطفی فی اخبار مولد النبی نام تحریر کیا ہے۔



اور المنهاج میں معراج نبوی پر بحث کی گئی ہے، جیسا کہ خود کتاب کے نام سے بھی واضح ہوتا ہے۔

## مولانا عبدالنبی اکبر آبادی (م گیارہویں صدی ہجری نصف اول)

مولانا عبدالنبی بن شیخ عبداللہ شطاری کا نام عماد الدین محمد عارف عثمانی سندیلوی اکبر آبادی ہے، ممتاز عالم اور صوفی تھے اور شیخ عبداللہ شطاری اکبر آبادی سے بیعت تھے، ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں، ان کی مشہور تصنیف "فواتح الانوار" سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں بقید حیات تھے، انہوں نے اس کتاب کی تصنیف سے فراغت کی تاریخ ۱۰۲۰ھ تحریر کی ہے (۱)

مولانا عبدالنبی کی تصانیف کی تعداد بے شمار ہے، جو مختلف موضوعات پر محیط ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں، فواتح الانوار شرح لوائح الاسرار، ذریعة النجاة شرح مشکوة، شرح الفصوص، شرح الغیبة، شرح الجواهر الخمسة، شرح تحفة حل الودود، الروائح شرح اللوائح، شوارق اللمعات، شرح خلاصة العشق، فیض الخبیر، رسالة فی اسم الذات، شرح حدیث معراج المومنین اور ایک رسالہ معراج النبی ﷺ کے بیان میں ہے۔

## شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)

شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی فقیہ، محقق، مؤرخ اور ممتاز محدث تھے، ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے آباو اجداد بخارا سے دہلی آکر آباد ہوئے تھے۔

ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت خصوصاً شمالی ہند میں کتب حدیث کو رواج دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے، اسی لیے شیخ محدث کے لقب سے مشہور ہیں۔

شیخ عبدالحق نے حفظ قرآن صرف دو سال تین ماہ میں مکمل کیا، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، پھر دہلی کے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے اور مولانا محمد مقیم اور دیگر اساتذہ سے ۲۲ سال کی عمر میں تمام علوم کی تکمیل کی، اس کے بعد حرمین شریفین جاکر وہاں کے علمائے کبار بالخصوص شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں رہ کر فن حدیث میں اختصاص پیدا کیا اور انہیں سے اجازت سند حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے اور درس وتدریس

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۵، نزہۃ الخواطر ۵/ ۲۶۱۔

تصنیف وتالیف اور افادۂ علم میں مصروف ہوئے ، انہوں نے فن حدیث کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصد بنایا، اس فن میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی ، سلسلۂ قادریہ میں سید موسی قادری کے مرید تھے ، ابتدا میں احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے اختلاف رائے رکھتے تھے، مگر بعد میں اپنے خیالات وافکار سے رجوع کرلیا، ۱۰۵۲ھ میں دہلی میں انتقال ہوا اور قطب صاحب میں حوض شمسی کے کنارے مدفون ہوئے (۱)

انہوں نے مختلف زبانوں میں مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ، جن کی تعداد سو سے متجاوز ہے ، ان میں سے چند مشہور کتابوں کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں ، زبدة الآثار ، لمعات شرح مشکوٰة، طریق الافادة فی شرح السعادة، شرح فتوح الغیب ، شرح اسماء الرجال بخاری ، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار ، جامع البرکات فی منتخب شرح المشکوٰة، ذکر اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث ، زاد المتقین ، مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین ، شرح الصدور بتفسیر آیة النور ، زبدة الاسرار، الصراط المستقیم ، فتح المنان فی مذهب النعمان ، مفتاح الغیب مدارج النبوة ، مراتب الفتوة فی سیر النبی ﷺ (مؤخر الذکر دونوں فارسی زبان میں سیرت نبوی پر مشتمل ہیں ) ان کے علاوہ سیرت پاک ﷺ کے موضوع سے متعلق مطلع الانوار العربیة فی الحلیة الجلیلة النبویة ان کی تصنیف کردہ ہے، فارسی اشعار کے ذریعہ بھی انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اپنی محبت والفت اور انسیت کا اظہار کیا ہے، یہ اشعار زیارت حرمین شریفین کے وقت کہے تھے، اس میں ساٹھ ابیات ہیں۔

## شیخ صلاح الدین (م ۱۰۹۸ھ)

شیخ صلاح الدین بن شیخ سلیمان ۱۰۵۱ھ میں پیدا ہوئے ، ان کا تعلق جنوبی ہند سے تھا، ۱۰۹۸ھ میں ان کی وفات ہوئی ، ان کے بارے میں مزید معلومات فراہم نہ ہوسکی۔

ان کی زندگی سیرت پاک ﷺ پر درس اور تصنیف وتالیف کے لیے وقف تھی ، ان کی تصانیف میں عمدة الحجاج او مولد فی مدح الرسول ہے جو منظوم اور منثور دونوں طرح کی عبارت پر مشتمل ہے۔(۲)

(۱) سبحۃ المرجان ۱/ ۱۳۹ ، نزہۃ الخواطر ۵/ ۲۰۳ ، معجم المؤلفین ۵/ ۹۱ (۲) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک (انگریزی) محمد یوسف کوکن ، مدراس ۱۹۷۴ء ، ص ۵۵



## مولانا محمد حسین بیجاپوری (م ۱۱۰۸ھ)

مولانا محمد حسین بن خلیل اللہ بن قاضی احمد ناظی بیجاپور میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی ، محمد زبیر بیجاپوری سے مستفید ہوئے ، اس کے بعد گلبرگہ چلے گئے ، عالم گیر نے بیدر کے مدرسہ محمود گاؤں میں تدریسی کام پر مامور کیا، آخیر عمر تک اسی مدرسہ میں افادۂ علم میں مصروف رہے ، عین حالت نماز میں وفات ہوئی ، واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مسجد میں تراویح پڑھ رہے تھے قریب کے مکان میں بجلی گری جس سے مسجد بھی جلی اور مولانا بھی اسی میں شہید ہوگئے۔

مولانا تدریسی خدمت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول رہتے ، انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ، ان میں الازہار الفاتحة (تفسیر سورہ فاتحہ ) ، تلخیص الفنون الریاضة ، تلخیص الکافی (ابن حاجب کی کافیہ کی تلخیص ) ، عقائد اور رسم الخط وغیرہ پر کئی رسائل اور سیرت پاک ﷺ کے موضوع پر ایک کتاب تحبیب الطیب والنسا الی سید الانبیا وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔(۱)

## مولانا عبد النبی ہندی (م ۱۱۱۸ھ کے بعد)

مولانا عبد النبی بن آدم حنفی ہندی ممتاز عالم ہیں ، ان کے مزید حالات زندگی دستیاب نہ ہوسکے۔

مولانا حکیم سید عبد الحئی سابق ناظم ندوۃ العلما نے ان کی ایک کتاب تلخیص شمائل ترمذی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بارہ میں بتایا ہے کہ یہ کتاب اپنے دو صاحب زادوں کے لیے لکھی تھی جن کے نام عبد الرؤف اور عبد الحمید تھے اور اس کی تکمیل ۱۱۱۸ھ میں ہوئی (۲) ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبد النبی ہندی بارہویں صدی ہجری کے نصف اول کے مصنفین میں ہیں ، مولانا عبد الحئی کی نظر سے مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا بہت خوبصورت اور خوش خط نسخہ گزرا تھا جس پر ملا عصام کے بیش قیمت حواشی بھی تھے۔

## حکیم محمد اکبر دہلوی (م ۱۱۲۹ھ)

حکیم محمد اکبر بن محمد مقیم حنفی دہلوی ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کے عہد

(۱) نزہۃ الخواطر ۶/ ۲۹۸ (۲) نزہۃ الخواطر ۶/ ۱۷۲

کے مشہور اور ماہر طبیب تھے، جو سلسلۂ قادریہ سے وابستہ تھے، ان کے حلقۂ درس سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے، ان میں سید عبدالفتاح گلشن آبادی، مولوی سید عمادالدین اور مفتی عبداللطیف وغیرہ قابل ذکر ہیں، ۱۱۲۹ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

حکیم صاحب کی اکثر تصانیف طب کے موضوع پر ہیں، جن میں میزان الطب، الطب الاکبر، حدود الامراض، منتخب الکبری، مجربات اکبری، مفرح القلوب، قرابا دین قادری اور تلخیص الطب النبوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، مؤخر الذکر تصنیف میں مصنف نے نبی کریم ﷺ کے طریقۂ علاج پر بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ آپ کن چیزوں سے علاج فرماتے تھے(۱)

## مولانا محمد شاکر لکھنوی (م ۱۱۳۳ھ)

مولانا محمد شاکر بن عصمۃ اللہ بن عبدالقادر عمری لکھنوی مشہور عالم تھے، اپنے والد اور دادا کے علاوہ مفتی وجیہہ الدین گوپامئوی اور شیخ پیر محمد لکھنوی وغیرہ سے اکتساب علم کیا، صرف انیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہوئے اور اسی دوران ۱۱۳۳ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے والد کے پاس دفن ہوئے۔

ان کی یادگار تصانیف میں شرح تہذیب المنطق (للتفتازانی) الرسالۃ الاعتقادیۃ، الرسالۃ القاسمیۃ، الرسالۃ المنتخبۃ فی احوال الموتی، خلاصۃ المناقب، حل اللغات القرآنیۃ وغیرہ ہیں، ان کے علاوہ شاہ عالم بن عالم گیر کی فرمائش پر بوصیری کے مشہور قصیدہ بردہ کی شرح بھی لکھی (۲)۔

## مولانا سعد اللہ سلونی (م ۱۱۳۸ھ)

مولانا سعد اللہ بن عبدالشکور حسینی سلونی مشہور وممتاز عالم تھے، وہ سلون (ضلع رائے بریلی) میں پیدا ہوئے اور وہیں پرنشوونما پائی، شیخ پیر محمد سلونی کی اولاد میں سے تھے، تمام تر تعلیم وہیں پر مکمل کی اور کم سنی میں فارغ ہوگئے، اس کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے، وہاں پر تقریباً بارہ سال تک تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، ان کے شاگردوں میں بہت سے جلیل

(۱) نزہۃ الخواطر ۶/ ۲۸۲، (۲) نزہۃ الخواطر ۶/ ۳۱۵۔



القدر علما گزرے، اہل مکہ کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری اور شیخ احمد نخلی وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا اور بیعت بھی ہوئے، مکۃ المکرمہ سے واپسی کے بعد سورت میں مستقل سکونت اختیار کرکے افادۂ علم اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے، یہاں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور مستفید ہونے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، عالم گیر ان کی بڑی عزت کرتا، دو گاؤں ان کو دے دیئے تھے، جس سے ہزاروں کی آمدنی ہوتی تھی، بادشاہ ان کی کوئی سفارش رد نہیں کرتا، ان کے خطوط کا جواب خود ہی دیا کرتا اور سیدی کہہ کر مخاطب کرتا اور سلطان الہند کے خطاب سے نوازا تھا، مولانا کے دو بیٹے عبدالعلی اور عبدالولی تھے، مؤخر الذکر کمالات علمی میں اپنے والد ہی کی طرح تھے، اور عزلت تخلص کرتے تھے، ۱۱۳۸ھ میں مولانا سعد اللہ کا انتقال سورت میں ہوا۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، چند کے نام درج ذیل ہیں، حاشیۃ ہدایۃ الحکمت، حاشیۃ کشف الحق، حاشیۃ یمین الوصول، تعلیقات علی الحاشیۃ القدیم والجدید، تعلیقات علی آداب البحث، رسالۃ فی المنطق وغیرہ، ان کے علاوہ تحفۃ الرسول کے نام سے بھی ایک کتاب ہے جو سیرت پاک کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے(۱)۔

## مولانا حبیب اللہ قنوجی (م ۱۱۴۰ھ)

مولانا حبیب اللہ حنفی قنوجی مؤرخ وفقیہ قنوج میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سندیلہ میں حاصل کرنے کے بعد جون پور میں مولانا عبدالباقی بن غوث جون پوری کے مدرسہ میں بقیہ تعلیم مکمل کی، اس کے بعد الہ آباد جاکر شیخ عبدالجلیل الہ آبادی سے بیعت ہوئے اور ان کی خدمت میں رہ کر علم وعمل میں کمال حاصل کیا، اپنے درس وتدریس اور افادۂ علم کے دوران ۱۱۴۰ھ میں وفات پائی (۲)۔

مولانا حبیب اللہ قنوجی کی تصانیف میں مذاق الصوفیۃ، خلاصۃ الاکتساب، الجواہر الخمسۃ، تذکرۃ الاولیا اور سیرت پاک ﷺ کے موضوع سے متعلق روضۃ النبی (شمائل) وغیرہ قابل ذکر ہیں، روضۃ النبی کا قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری میں موجود ہے (۳) ان تصانیف کے علاوہ فقہ ومنطق کے موضوع پر متعدد رسایل بھی ان کی یادگار ہیں۔

(۱) نزہۃ الخواطر ۶/ ۹۶، سبحۃ المرجان ۱/ ۲۲۸ (۲) نزہۃ الخواطر ۶/ ۶۲، الاعلام، ۲/ ۱۷۲، معجم المؤلفین ۳/ ۱۸۷ (۳) ہندوستان میں عربی سیرت نگاری۔ ایک جائزہ (مضمون) ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری تحقیقات اسلامی علی گڑھ، شمارہ ۲ جلد ۱۶، ۱۹۹۷ء۔

## شیخ وجیہہ الحق پھلواروی (۱۱۵۰ھ)

شیخ وجیہ الحق بن امان اللہ پھلواری شریف (پٹنہ) میں ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، شیخ محمد عتیق بہاری سے درس حدیث لیا اور شاہ محمد مخدوم سے اجازت وسند لی اور پھر درس وافادۂ علم میں مصروف ہوئے، تلاش معاش کے سلسلے میں غازی پور کا سفر کیا مگر کچھ دنوں قیام کے بعد اپنے وطن لوٹ کر تا حیات علمی خدمت میں مشغول رہے اور ۱۱۵۰ھ میں وہیں وفات پائی (۱)۔

ان کی تصانیف میں نزهة السالكين کے علاوہ فضائل وعبادات میں ایک رسالہ ہے اور سیرت پاک ﷺ کے موضوع سے متعلق شرح شمائل النبی ؐ (للترمذی) ہے، اس میں حدیث کے لغوی ومعنوی مشکلات کی وضاحت کرتے ہوئے فقہا ومحدثین کی آرا کو بھی مختصراً درج کیا ہے، یہ جامع اور مفید شرح ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ پھلواری شریف میں موجود ہے۔

## مولانا محمد ہاشم سندھی (م ۱۱۷۴ھ)

مولانا محمد ہاشم بن عبدالغفور بن عبدالرحمن حنفی تتوی سندھی حدیث وفقہ اور عربی کے ممتاز فاضل تھے، وہ سندھ میں ۱۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے مولانا ضیاء الدین سندھی سے ابتدائی تعلیم کے بعد حرمین شریفین کا سفر کیا، حج وزیارت سے فراغت کے بعد شیخ عبدالقادر بن ابی بکر صدیقی مکی کی خدمت میں رہے، بعد میں حدیث وفقہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس اور افتا کی خدمت انجام دی، علمی وعملی دونوں حیثیتوں سے ممتاز ومقبول تھے، ان کی ذات سے اہل سنت والجماعت کو بڑی تقویت پہنچی، سینکڑوں مقتدر اور ذی حیثیت لوگ ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے، دینی معاملات کا کوئی بھی حکم نامہ ان کی مرضی کے بغیر جاری نہیں ہوتا تھا، ۱۱۷۴ھ میں انتقال ہوا (۲)

انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان میں فضائل قرآن کے موضوع پر جنة النعيم، حلال وحرام سے متعلق فاكهة البستان، رفع یدین کے موضوع پر

---

(۱) نزہۃ الخواطر ۶ / ۳۹۷ (۲) نزہۃ الخواطر ۶ / ۳۶۳، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۴۔



كشف الرين، حياة القلوب فى زيارة المحبوب اور فرائض اسلام کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب ہے، ان کے علاوہ نبی کریم ﷺ کی حیاۃ مبارکہ پر ایک مکمل تصنیف '' بذل القوة فى سنى النبوة '' کے نام سے ہے۔ یہ کتاب ۱۱۶۶ھ میں مکمل ہوئی ہے، اس میں آپ ؐ کے دور نبوت کی زندگی کے حالات وواقعات بیان کیے ہیں، یعنی بعثت سے وفات تک کے احوال کا تذکرہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ۲۸۲ صفحات پر مشتمل رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، اس کی کتابت ۱۱۹۹ھ میں رحیم بخش نے کی تھی، دوسرا نسخہ محمد فضل علی کا لکھا ۱۲۴۴ھ کا ہے، یہ ۱۴۶ اوراق پر مشتمل کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں ہے اور امیر احمد عباسی کا محقق (مطبوعہ ۱۹۶۶ء) نسخہ ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں محقق کا سو صفحات پر مشتمل ایک جامع مقدمہ بھی ہے، اصل کتاب ۳۰۷ صفحات پر مشتمل ہے باقی صفحات اعلام، اماکن، ماخذ، فہارس اور استدراک وغیرہ پر مشتمل ہے، اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ میں موجود ہے جو ۱۹۶۶ء میں حیدر آباد، پاکستان سے چھپا ہے۔

## شیخ ابوالحسن سندھی (م ۱۱۸۷ھ)

شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی سندھ میں پیدا ہوئے، یہ ابوالحسن سندھی صغیر کے نام سے مشہور ہوئے، ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد مدینۃ المنورہ کا سفر کرکے شیخ محمد حیات سندھی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام علوم کی ان سے تحصیل کی، پھر اسی مبارک سرزمین پر درس و تدریس میں مصروف ہوئے، ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے ان میں ابوسعید ابن محمد ضیا شریف حسنی بریلوی اور شیخ امین بن عبدالحمید علوی کاکوروی مشہور ومعروف لوگوں میں ہیں، تدریسی خدمت کے دوران ہی ۱۱۸۷ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی (۱)

شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کی تصانیف میں جامع الاصول کے علاوہ سیرت نبوی ﷺ کے موضوع سے متعلق ایک کتاب مختار الاطوار فى اطوار المختار ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ اوقاف پھلواری شریف پٹنہ میں محفوظ ہے۔

---

(۱) مساهمة الهند باللغة العربية فى ادب الحديث النبوى ۳ / ۳۲۲، سید محمد خالد علی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۹۲ء، نیز نزہۃ الخواطر ۶ / ۶

## مولانا احمد بن عبداللہ مدراسی (م ۱۱۸۹ھ)

مولانا احمد بن عبداللہ نائطی نظام الدین مدراسی بیجاپوری مشہور عالم تھے، ۱۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے، یہ بہت ذہین وفہیم، اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ کے مالک اور بڑے وجیہہ، بارعب اور شان وشوکت والے تھے، فقہ وحدیث اور دیگر علوم عربیہ کے ماہر تھے، ۱۱۸۹ھ میں ان کی وفات ہوئی، مزید حالات دستیاب نہ ہوسکے۔

مولانا احمد بن عبداللہ کے زیادہ تر علمی کاموں کا دائرہ تراجم وشروح تک محدود ہے، ان میں سرور الصدور کے نام سے زبور کا فارسی ترجمہ اور فیض الجلیل کے نام سے انجیل کا فارسی ترجمہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، فارسی ہی میں فتح الوہاب المجید اور فیض الوہاب شرح خلاصۃ الحساب وغیرہ بھی ہیں ان کی عربی تصانیف میں وقائع نہفتہ اور سیرت پاک ﷺ کے موضوع سے متعلق انباء الاذکیاء بتحبیب الطیب والنسا ای سید الانبیا وغیرہ ہیں، وقائع نہفتہ میں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کی آپسی جنگ وجدال کو بیان کیا گیا ہے اور مؤخر الذکر کو شیخ احمد مدراسی نے والا جاہ اول کے بھائی محمد محفوظ خاں کی فرمایش پر لکھا تھا، جو ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے (۱)۔

## نواب محمد محفوظ گوپامئوی (م ۱۱۹۳ھ)

نواب محمد محفوظ بن انور الدین بن محمد انور عمری گوپامئوی علوم عقلیہ ونقلیہ کے ممتاز و مشہور عالم تھے، وہ ایثار وفیاضی اور شجاعت وصلہ رحمی میں یکتا اور بے نظیر شخصیت کے مالک تھے، علمی سفر کی تکمیل کے بعد درس وتدریس میں بھی حصہ لیا، تصنیف وتالیف کے علاوہ شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے، ۱۱۹۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۲)

مولانا گوپامئوی نے مختلف کتابوں پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، فارسی زبان میں اشعار بھی یادگار ہیں اور سیرت پاک ﷺ کے موضوع پر قرۃ العین فی فضائل رسول الثقلین لکھ کر مصنفین سیرت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

اس مضمون میں بارہویں صدی ہجری تک کے سیرت نگاران ہند اور ان کی عربی تصانیف کا مختصر ترجمہ وتعارف کرایا گیا ہے، انشاء اللہ آئندہ ان کے بعد کے لوگوں کی کوششوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

---

(۱) عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۹۰، نیز نزہۃ الخواطر ۶/۲۲ (۲) نزہۃ الخواطر ۶/۳۴۸، عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ص ۹۰۔



# اخبار علمیہ

"المجتمع" میں شایع ہونے والی خبر کے مطابق سعودی نژاد بوسنیا کی ایک بیس سالہ لڑکی امینہ کابونے ایک دن سے بھی کم وقت میں قرآن مجید کے ۱۸/پارے حفظ کر لئے، اس سے پہلے اس نے ۱۲/پارہ حفظ کیا تھا، یہ نابغہ روزگار سرائیوو کے کلیۃ الدراسات الاسلامیہ کی طالبہ ہے، رپورٹ میں دوسری بار کے لئے کہا گیا ہے کہ اس نے باقی ۱۸/پارے ساڑھے چھ بجے سے یاد کرنا شروع کیا اور جمعہ کی نماز سے پہلے ہی انہیں حفظ کر ڈالا، جمعہ کی نماز کے بعد پانچ رکنی امتحان کمیٹی نے اس سے پورے قرآن کا امتحان لیا اور امینہ کابونے اپنے جواب سے ممتحنین کو مطمئن کیا، امتحان کمیٹی کے صدر نے کہا کہ بوسنیا میں امینہ جیسی باصلاحیت اور ذہین طالبات سے اللہ تعالی اپنے دین کی بڑی بڑی خدمت لے گا۔

---

اسلام اور اسلامی فکر پر جو حملے زور شور سے کئے جارہے ہیں ان کا الزامی جواب دینے اور ان کی حقیقت سامنے لانے کے لئے الازہر یونیورسٹی نے ایک ٹی وی سیٹلائٹ چینل کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے، یہ پروجیکٹ اسلامک ریسرچ اکیڈمی کے ایک ممبر عبدالرحمن الاداوی کی درخواست پر الازہر یونیورسٹی کمان کے ملاحظہ ومنظوری کے لئے بھیج دیا گیا ہے، عبدالرحمن الاداوی نے کہا کہ اسلام، قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر موجودہ ذرائع ابلاغ کے حملوں کا جواب دینے کے لئے اس چینل کا قیام ایک مذہبی فریضہ ہے، جدید مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے قوانین کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ چینل اسلام کے متعلق ہر طرح کے شکوک، شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گا چینل مکمل طور پر الازہر یونیورسٹی کے زیر انتظام ہوگا، یہ خبر عرب نیوز میں شایع ہوئی ہے۔

---

"واشنگٹن ٹائمس" کی ایک خبر میں کہا گیا ہے کہ "ہیری پاٹر" ناول امریکی جیل گوانتاناموبو کے قیدیوں کی پہلی پسند ہوگئی ہے، اس کے قارئین کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا ہے، وہاں کے ایک مقامی کتب فروش کے بیان کے مطابق اس کتاب سے لوگ بہت متاثر ہیں اور اس پر مبنی فلم کو

دیکھنے کے لئے گوانتاناموبو کے محبوس افراد خاص طور پر بہت بے تاب ہیں، ''ہیری پاٹر'' ایک برطانوی مصنفہ جے کے رالنگ کا ناول ہے، جو بچوں کے لئے لکھا گیا اور حیرت انگیز اور عجیب و غریب کارناموں پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ ہے، حال ہی میں گوانتاناموبو کے قیدیوں کے ساتھ امریکی فوجیوں کے انسانیت سوز مظالم کی خبر نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اور دنیا کے شاید ہی کسی اخبار یا میگزین نے اس داستان ظلم پر قلم نہ اٹھایا ہو، اس کے بعد اس جور و استبداد کی تحقیق و تفتیش کے لئے امریکی کانگریس کے ایک نمائندہ گروپ نے اس کا دورہ کیا تھا۔

---

نیوزی لینڈ کے نہ اڑنے والے کیوی نامی پرندہ کی نسل بڑی تیزی سے ختم ہو رہی ہے، انٹرنیشنل جرنل آف ورٹی بریٹ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کیوی کی ۶ نسلوں کا وجود خطرے میں ہے اور آیندہ سال ان کی تعداد صرف ۵۷؍ہزار ہی رہ جائے گی، جن میں ان کی دو نسلوں کی تعداد صرف سو سو ہی رہے گی، اس پرندہ کے ایک خاص محقق و ماہر نے لکھا ہے کہ ۱۰ برس پہلے کیویوں کی تعداد ۸۵ ہزار سے زیادہ تھی، چوں کہ کیوی پر پرواز رکھنے کے باوجود اڑ نہیں پاتا اس لئے کتا، بلی اور دوسرے شکاری درندوں کا لقمہ بن جاتا ہے، انہوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ حکومت نیوزی لینڈ اس کے تحفظ کا اعلان کرنے کے باوجود اس کے تحفظ اور افزائش نسل کا سامان کرنے سے بے توجہی برت رہی ہے، محققین کیوی کی جسمانی ساخت اس کے خورد و نوش اور رہنے سہنے کے طور طریقوں کو موضوع تحقیق بنائے ہوئے ہیں، مگر ان کو قابو میں کرکے ان کی حفاظت، پرورش اور افزائش کا ان کا خواب ابھی ادھورا ہے جس کی وہ سخت ضرورت بتاتے ہیں۔

---

سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں آئے دن نت نئی ایجادات و اختراعات ہوتی رہتی ہیں جس کی حوصلہ افزائی کے لئے داد و دہش اور انعامات و اعزازات کا سلسلہ بھی جاری ہے، حیدرآباد کے دھرمپا بارکی کو شمسی توانائی سے چلنے والی ایشوریہ نامی لالٹین بنانے، بنگلور کے ہریش پانڈے کو ''سولر ہوم سسٹم'' کی ایجاد کے لئے اور چندی گڑھ کے نجوریا کو کلائمٹ کیر ایوارڈ دیا گیا، نجوریا نے فصلوں کے کچرے سے جلنے والا اسٹوپ بنایا ہے، برطانیہ کے عالمی ترقیاتی امور و مسائل کے کیبنٹ وزیر ہیلری بین کے ہاتھ یہ اعزازات رائل جغرافیکل سوسائٹی، لندن کی پر



رونق تقریب میں تقسیم کئے گئے، ایوارڈ پانے والوں میں نیپال کے سندر باجگین بھی ہیں، ان کو گھروں میں کھانا پکانے کے لئے بایوگیس ایجاد کرنے کے لئے ایوارڈ دیا گیا، ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کی رقمیں دی گئی ہیں، حیدرآباد کے بارکی نے کہا کہ وہ اس رقم کو ہندوستان میں شمسی توانائی کی ترقی کے لئے صرف کریں گے۔

---

''مسلم دنیا میں دستکاری اور صنعت کاری'' کے نام سے ایک کتاب انگریزی اور عربی زبان میں IRCICA نے شائع کی ہے، یہ ۱۰ تا ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۶ء میں اسلام آباد میں منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، اس میں مسلم ملکوں کے علاوہ یورپ اور یو، ایس، اے کے بعض ماہرین اور اسکالرس کے مضامین بھی شامل ہیں، جس سے مقالہ نگاروں کے متعدد نقطہ نگاہ بھی سامنے آتے ہیں، نیز اس سے مسلم ملکوں میں فن دست کاری کی ترقی کی تاریخ، اس کی نوعیت بالخصوص اس کے ابتدائی عوامل، تجارتی اشیا اور مصنوعات کی تقسیم کاری اور انہیں اعلا معیار اور ترقی دینے کی کوششوں کا بطور خاص علم ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہاں اسلامی آرٹ کے موضوع پر ہونے والے عالمی فیسٹیول کے متعلق رپورٹ اور معلومات بھی اس میں درج ہیں، محققین نے اپنے اپنے مقالوں میں اس میدان کی تمام سرگرمیوں، مسایل اور ترقی کے اصول و ضوابط پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

---

جاپان نے اپنی ہائی ٹکنالوجی سے ''واکامارو'' نامی روبوٹ تیار کرلیا ہے جو نوکر کے مانند گھر کے کام کاج کرے گا، واکامارو میں تقریباً ۱۰ ہزار لفظوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہے، وہ دو پہیوں پر چلتا ہے اور اس کی بیٹری چارج کی جاسکتی ہے، ایک میٹر لمبا یہ روبوٹ کامیاب ''پرسنل سکریٹری'' بننے اور پہرہ داری، بات چیت اور تیمارداری کا کام بھی دے سکتا ہے، متشی بوشی ہیوی انڈسٹریز نے اس کو تیار کیا ہے اور آیندہ ماہ سے جاپان میں اس کا استعمال ہونے لگے گا، اس کا وزن ۳۰ رکلوگرام ہے، اور اس کی قیمت ۱۴ رہزار تین سو ڈالر تقریباً ۶ رلاکھ ۴۰ ہزار روپے رکھی گئی ہے۔

ک، ص، اصلاحی

---

تلخیص و ترجمہ

## بصرہ یونی ورسٹی کی لائبریری کے بعض مخطوطات

''خزائن الکتب القدیمۃ فی العراق'' مصنفہ کورکیس عواد میں قدیم زمانے سے ایک ہزار ہجری تک کے کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کا ایک باب بصرہ کے درج ذیل کتب خانوں پر مشتمل ہے۔

۱۔خزانۃ الوقف بالبصرہ: یہ لائبریری چوتھی صدی ہجری میں ابن سوار نے قایم کی تھی۔

۲۔دار الکتب فی البصرہ: اس کتب خانہ کو ۴۸۳ھ میں نذر آتش کر دیا گیا تھا۔

۳۔خزانۃ رباط باتکین فی البصرہ: اس کو باتکین نے قایم کیا تھا جس کی وفات ۶۴۰ھ میں ہوئی۔

۴۔خزانۃ ابی عمرو بن العلا المازنی: اس کتب خانہ کا انتساب ابوعمرو بن العلا کی جانب ہے جس کا انتقال ۱۵۴ھ میں ہوا۔

۵۔خزانۃ ابن درید: ابن درید کی وفات ۳۲۱ھ میں ہوئی۔

۶۔خزانۃ الحبشی بن معز الدولہ البویہی: ۳۵۷ھ میں یہ کتب خانہ موجود تھا۔

۷۔خزانۃ الوزیر ابن شاہ مروان: ۴۸۳ھ میں اس کو جلا دیا گیا تھا۔

۸۔خزانۃ ابی خلیفہ: چوتھی صدی ہجری کا کتب خانہ۔

مذکورہ بالا کتب خانوں کے علاوہ اور بھی بہت سے کتب خانے گردش ایام کی نذر ہوگئے، بیسویں صدی عیسوی میں علما و فضلا نے عراقی حکومت کو جدید کتب خانوں کے قیام کی ضرورت و اہمیت کی جانب توجہ دلائی تاکہ ان میں مدارس اور مسافر خانوں کے باقی ماندہ مخطوطات اور بعض اشخاص اور خاندانوں کے ذاتی ذخائر کتب محفوظ ہوجائیں، مگر حکومت کو کسی حد تک ہی اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔



بصرہ یونی ورسٹی کا کتب خانہ: بصرہ یونی ورسٹی کے مرکزی کتب خانہ کا شمار عراق کے اہم کتب خانوں میں ہوتا ہے، اس میں معتد بہ فارسی مخطوطات کو چھوڑ کر صرف عربی کے تقریباً ایک ہزار مجلد مخطوطات ہیں، اس کتب خانہ کا قیام ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا تھا، محققین نے اس کی اور بعض دوسرے ممتاز کتب خانوں کی فہرستیں تیار کی ہیں جن میں علی الخاقانی، صباح محمد علی، کورکیس عواد، عبدالجبار عبدالرحمن وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، گوکہ اب ان میں سے بعض طبع ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ چکے ہیں، تاہم ان میں متعدد ایسے ہیں جو آج بھی نادر و کمیاب ہیں، ذیل میں اس کتب خانہ کے مخطوطات کی ایک فہرست نقل کی جاتی ہے، جس سے مسلمانوں کے آباد کردہ اس شہر کی علمی عظمت و بلند مایگی کا اندازہ ہوگا۔

۱۔انوار التنزیل واسرار التاویل: یہ تصنیف ناصر الدین عبداللہ بن عمر بن محمد البیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی مشہور و متداول تفسیر، سنہ کتابت درج نہیں، کل صفحات ۳۷۵، لائبریری کا اندراج نمبر ۲۹۵۔

۲۔المفردات فی غریب القرآن: ابوالقاسم حسین بن محمد معروف بہ راغب اصفہانی (متوفی ۴۰۰ھ) اس کے مصنف ہیں، ۱۰ رمضان ۱۰۶۱ھ میں یہ کتاب نقل کی گئی، کاتب کا نام درج نہیں، اس کا حجم ۳۰۸ صفحات ہے، اندراج رجسٹر نمبر ۳۴۸۔

۳۔الطیبۃ فی قراءات العشرۃ: مصنف شمس الدین محمد بن محمد العمری معروف بہ ابن الجزری (متوفی ۸۳۳ھ) سنہ کتابت ذی الحجہ ۱۱۸۲ھ کاتب غیر معلوم، اندراج نمبر: ۱۶۳۔

۴۔العنوان فی القراءات السبع: ابوطاہر اسماعیل بن خلف الانصاری اندلسی متوفی ۴۵۵ھ کی یہ تصنیف ہے، نسخہ ناقص ہے، تاریخ کتابت درج نہیں، کل صفحات ۸۷۔

۵۔بہجۃ المحافل: ابوزکریا یحیٰی بن ابی بکر عامر یمنی (۸۹۳ھ) کا یہ مخطوطہ تین اقسام میں منقسم ہے، پہلی قسم میں رسول اللہ کی وفات تک کے حالات درج ہیں اور یہ ۶ ابواب پر مشتمل ہے، دوسری قسم رسول اللہ کے اسماء، اخلاق و عادات اور معجزات کے لیے مخصوص ہے اور یہ چار ابواب میں محیط ہے اور تیسری قسم میں آپؐ کے شمائل و فضائل کا بیان ہے اور اس میں تین ابواب ہیں، اس کے کاتب کا نام احمد بن قاسم الامیر ہے، سال کتابت

ربیع الاول ۱۱۸۵ھ ہے، کل صفحات ۲۴۰، اندراج نمبر: ۱۶۲۔

۶۔السیرة النبویة والآداب المرویة: اس کے مؤلف کا نام عبداللہ بن نوراللہ ہے، کاتب کا نام معلوم نہیں، یہ عبداللہ بن علی بن ناصر الحظی ۱۲۱۷ھ کی ملکیت میں تھا، کل صفحات ۳۸۹، اندراج نمبر: ۲۰۶

۷۔المواهب اللدنیة: سیرت کی مشہور کتاب جس کے مؤلف شہاب الدین بن محمد القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ ہیں عثمان بن جاراللہ یمانی نے ۶رشوال ۱۲۱۸ھ میں اس کی کتابت مکمل کی ہے، کل صفحات ۲۵۴، اندراج نمبر: ۱۱۳

۸۔شفاء القلوب فی احادیث النبی المحبوب: محمد بن حسن وادی الصیادی الرفاعی متوفی ۱۳۲۸ھ کی تصنیف ہے، کل صفحات ۱۰۷۰، اندراج نمبر: ۱۹۳

۹۔مصابیح السنة: شروح حدیث میں حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ کی ممتاز تصنیف۔ اس کی کتابت احمد بن عمر بن عبدالعزیز نے سنیچر ۱۶رذی قعدہ ۱۰۵۷ھ میں مکمل کی، کل صفحات ۱۶۵، اندراج نمبر ۳۲۰۔

۱۰۔التوضیح: فقہ میں مصطفیٰ بن زکریا کرمانی متوفی ۸۰۹ھ کی مشہور کتاب جو سمرقندی متوفی ۷۵۰ھ کی کتاب مقدمة الصلوة کی شرح ہے، سنہ کتابت ۱۰۳۷ھ ہے، اندراج نمبر: ۹۔

۱۱۔جواهر الفقه: طاہر بن اسلام انصاری خوارزمی کی یہ کتاب ہے، اس کا سال تصنیف ۱۷۷ھ ہے، کل صفحات ۵۳۲، اندراج نمبر: ۱۱

۱۲۔معالم الدین و ملاذ المجتهدین: ابو منصور حسن بن زین الدین عاملی متوفی ۱۱۱۱ھ کی اس تصنیف پر سنہ تصنیف وکتابت درج نہیں، کل صفحات ۱۶۲، اندراج نمبر ۳۹۶۔

۱۳۔النیل: سیف بن نمیر بن ناصر کی اس تصنیف کا سال کتابت ۱۳۰۵ھ اور کاتب کا نام راشد بن عزیز الخصیبی ہے، کل صفحات ۳۸۸، اندراج نمبر ۲۹۰۔

۱۴۔تعارض البینات: غانم بن محمد بغدادی کی تصنیف ہے جس کی کتابت ۱۲۲۴ھ میں مکمل ہوئی، کل صفحات ۲۹، اندراج نمبر: ۸

۱۵۔الجوهرة النیرة: یہ کتاب ابوبکر بن علی الحداد حنفی ملقب بہ رضی الدین متوفی



۸۰۰ھ کی تصنیف کردہ ہے، تاریخ کتابت بروز دوشنبہ ۲۸ جمادی الاول ۱۰۲۵ھ ہے، کل صفحات ۸۹، اندراج نمبر: ۱۰۲

۱۶۔کفایة الطالب الربانی فی شرح رسالة ابن ابی درید القیروانی: ابوالحسن علی بن ناصر الدین شاذلی، مالکی متوفی ۹۳۹ھ نے ۱۷رذی الحجہ ۹۲۵ھ میں یہ کتاب لکھی، اس کی کتابت علی بن رجب القیومی مالکی نے ۳رجمادی الثانیہ ۱۱۹۸ھ میں کی، ۱۸۴صفحات، اندراج نمبر: ۲۹۰۔

۱۷۔عمدة السالک وعدة الناسک: شہاب الدین احمد بن لولو معروف بہ ابن نقیب متوفی ۷۶۹ھ اس کے مصنف ہیں، تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں، کل صفحات ۹۲، اندراج نمبر ۵۸۷۔

۱۸۔شرح اشعار الشعرا الستة الجاهلین: یوسف بن سلیمان معروف بہ اعلم الشنتمری متوفی ۴۷۶ھ کی یہ کتاب دور جاہلیت کے مشہور شعرا امراء القیس، نابغہ ذبیانی، علقمة الفحل، زہیر بن ابی سلمیٰ وغیرہ کے دواوین کی شرح ہے، ۱۸ررمضان ۱۲۹۷ھ اس کا سنہ کتابت ہے، صفحات ۱۳۳، اندراج نمبر: ۲۶۴۔

۱۹۔تاریخ الاسلام الکبیر: شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ کی اس کتاب کا یہ ناقص نسخہ ہے، سن کتابت درج نہیں ہے، اندراج نمبر ۳۳۱۔

۲۰۔الزبدة فی الطب: زین الدین اسماعیل بن حسن علوی جرجانی متوفی ۵۳۱ھ کی اس کتاب کی کتابت ۲۰رجمادی الاولی ۸۵۵ھ میں کی گئی ہے، کل صفحات ۳۱۰، اندراج نمبر ۱۹۵۔

ذیل میں مزید چند کتب خانوں اور ان کے نوادر کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔کتب خانہ عباسیہ: اس کتب خانے کے بانی آل باش تھے جن کا تعلق خلفائے عباسیہ سے تھا، اس خاندان کے علما کو نادر مخطوطات اور بیش بہا عربی مطبوعات کے جمع کرنے کا خاص ذوق و شوق تھا، چنانچہ یہ کتب خانہ دسیوں ہزار کتابوں پر مشتمل ہے جس میں ساڑھے پانچ سو نادر اور عمدہ مخطوطات ہیں، بعض کا تذکرہ ذیل میں رقم کیا جاتا ہے:

۱۔انباء الغمر بابناء العمر: مصنفہ لابن حجر العسقلانی

۲۔طبقات الشافعیة للاسنوی: سنہ کتابت ۸۶۴ھ ہے۔

۳۔شرح دیوان ذی الرمہ :لعبداللہ بن مفضل، سنہ کتابت ۶۹۵ھ ہے۔

۴۔المختار فی الطب :لابن ہبل الموصلی البغدادی سنہ کتابت ۱۱۴۳ھ ہے۔

۵۔العیون والنکت: (پانچویں جلد) یہ کتاب ۶۵۲ھ میں کتب خانے کو وقف کی گئی تھی،

۶۔کتاب الاقضیة :یہ کتاب بخط مؤلف ۸۳۲ھ میں رقم کی گئی۔

۷۔تلقیح فہوم الاثر :لابن جوزی۔

۸۔اسرار العربیة : ”

۹۔صید الخاطر : ”

۱۰۔ادب القضاۃ :لشرف الدین القرشی، ۸۵۶ھ میں لکھی گئی۔

۱۱۔النصرۃ فی اخبار البصرۃ: لاحمد نور الانصاری۔

۱۲۔شرح مقصورۃ ابن درید : لابن خالویہ سنہ کتابت ۷۸۷ھ ہے۔

۲۔کتب خانہ محمد احمد خاں: محمد احمد خاں بہادر ادیب تھے، ان کو کتابوں اور مخطوطات سے بڑا شغف اور دلچسپی تھی، ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنے مکان میں ایک کتب خانہ قایم کیا، جس میں پانچ سو عربی اور سو فارسی مخطوطات تھے، ۱۹۶۹ء میں یہ کتب خانہ بصرہ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں ضم کردیا گیا۔ اس کے بعض نوادر حسب ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر القرآن: للبغوی، یہ دو جلدوں میں ہے، سلطان شاہ رخ بن تیمور لنگ نے اس کی کتابت کرائی تھی۔

۲۔ الجار بردی: لاحمد بن امام السعید الجاربردی ۷۵۹ھ کی کتابت شدہ۔

۳۔ مشارق الانوار النبویة: (۷۳۳ھ کی تصنیف ہے)

۴۔ اختلاف الحدیث: (۶۲۴ھ میں لکھی گئی)

۵۔ الصراح بین اللغة: (۶۸۱ھ میں لکھی گئی)

۶۔ دیوان المار دینی : (۱۲۱۳ھ میں لکھا گیا)

۷۔ مجمع البحرین و مطلع النیرین: طریحی کی اس کتاب کا سنہ کتابت ۱۰۹۷ھ ہے،

۸۔ الکامل: (مبرد کی اس کتاب کا سنہ کتابت ۱۱۶۹ھ ہے)



۹۔ مسلک الافہام فی علم الکلام :علی بن احمد بن علی کی اس تصنیف کی کتابت ۵۵۹ھ میں ہوئی

۱۰۔ دیوان علی بن مقرب الاحسائی: (۱۲۵۹ھ کا نقل کردہ ہے)

۱۱۔ ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین : نووی کی اس تصنیف کا سنہ کتابت ۶۶۷ھ ہے۔

۳۔ کتب خانہ قزوینی : اس کتب خانہ کو محمد مہدی کاظمی قزوینی متوفی ۱۳۵۸ھ نے قایم کیا، پھر اس کا انتظام ان کے لڑکے سید امیر نے سنبھالا، اس میں ایک ہزار کتابیں تھیں، جس میں سو کے قریب مخطوطات تھے، بعض مخطوطات کا تذکرہ سطور ذیل میں ملاحظہ ہو:

۱۔ قرآن مجید کا نہایت عمدہ نسخہ جس کا ہر جز (پارہ) ایک ورق میں ہے۔

۲۔ کتاب الرجال : مصنفہ شیخ علا علی بن میرزا خلیل

۳۔ مقالہ فی القوس والہالہ: شیخ ابن ہیثم

۴۔ رسالہ فی العمل بالربع المجیب: شیخ جمال الدین ماردینی

۵۔ رسالہ فی کیفیة وضع الاسطرلاب: مصنفہ بیرونی

۶۔ رسالہ فی العمل بربع المقنطرات: مصنفہ ماردینی

۷۔ رسالہ فی الفرق بین الظلین والجیبین : مصنفہ عباس بن علی

۸۔ رسالہ فی تکثیر الدایرہ: مصنفہ ارشمیدس

۹۔ رسالہ فی العمل بالکرہ: (مصنف کا نام درج نہیں)

۱۰۔ رسالہ فی العمل بربع المقنطرات: شہاب الدین احمد بن المجدی

۱۱۔ بیان فی معرفة الساعات: مصنف نامعلوم

۱۲۔ حاشیة علی رسالة العمل بربع المقنطرات: عمر بن جلی

۱۳۔ تحریر المجسطی: نصیر الدین طوسی

۱۴۔ رسالہ انقاذ البشر: شریف مرتضی

۱۵۔ رسالة القضا والقدر: قاضی عبدالجبار معتزلی

(ماخوذ از ماہنامہ الحج والعمرۃ جنوری۔فروری ۲۰۰۵ء)

ک۔ص اصلاحی

# معارف کی ڈاک

## اقوال نبوی کا اعجاز

محترمی و مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جون کے معارف میں مضمون کی اشاعت کا شکریہ! آنجناب نے میرے مضمون پر حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے جو نوٹ تحریر فرمایا ہے اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں:

شاہ صاحب نے آپ کے اقوال و افعال کی دو اقسام بیان کی ہیں، ایک پیغمبرانہ اور دوسرے اپنے انسان ہونے کی حیثیت سے، آپ کے پیغمبرانہ اقوال و افعال بھی تشریعی حیثیت رکھتے ہیں ان کے علاوہ آپ کے اقوال کی ایک اور قسم بھی ہے، جن کا ماخذ وحی الٰہی ہے، مگر ان کا مقصد تشریع نہیں بلکہ اعجاز ہے، حضرت شاہ صاحب نے بھی آپ کے اقوال میں ملکوتی عجائبات کا ماخذ وحی الٰہی بتایا ہے، البتہ انہوں نے طب نبوی کو وہبی نہیں بلکہ کسبی قرار دیا ہے، یہی رائے ابن خلدون کی تھی، مگر چوں کہ اعجازی نوعیت کی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ علمی ترقی سے وا ہوئی ہیں، لہذا اس ضمن میں متقدمین کی آراء کو حرف آخر نہیں سمجھا جا سکتا، اور پھر یہ کہنا کہ طب نبوی غیر سائنٹفک ہے اور علمی اصولوں پر پوری نہیں اترتی، جیسا کہ ابن خلدون کی رائے ہے، طب پر آپ کے عمومی بیانات کسبی نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ اپنی معنویت میں انقلابی نوعیت کے ہیں، اور جہاں تک آپ کی بعض اشیا کو طبی طور پر استعمال کرنے کا تذکرہ ہے تو ان کی افادیت اور معنویت پر قدیم اور جدید طب دونوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور طب نبوی کے ان عجائبات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، طب نبوی پر میں نے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ہی کی طرح احادیث مبارکہ کے علوم و معارف کی بھی انتہا نہیں ہے اور وہ بھی معجزانہ ہیں، طب نبوی بھی ان میں سے ایک ہے، اس پر آئندہ مضمون ارسال کروں گا۔

طالب دعا

انیس الرحمن ندوی، بنگلور



# وفیات

## آہ ! پاسبان حرم ملک فہد

یکم اگست کو دنیائے اسلام پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ملک فہد بن عبدالعزیز سعودی حکومت کا تاج و تخت چھوڑ کر اس ملک الملوک کی بارگاہ کبریا میں پہنچ گئے جس کے ملک و سلطنت کو کبھی زوال نہ ہوگا اور وہ ہمیشہ قایم و باقی رہے گا، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

وہ ۱۹۹۵ء ہی سے بیمار چل رہے تھے، ان کی معذوری کی وجہ سے حکومت کا کاروبار بڑی حد تک ان کے بھائی اور ولی عہد عبداللہ بن عبدالعزیز انجام دینے لگے تھے، اس سال ملک فہد کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تو ۲۷ مئی ۲۰۰۵ء کو ریاض کے خاص شاہ فیصل اسپتال میں علاج کے لئے داخل ہوئے، مرض میں تخفیف و اضافہ ہوتا رہتا تھا، آخر یکم اگست بروز دوشنبہ داعی اجل کا پیغام آ گیا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

عالم اسلام اور پوری دنیا کے مسلمان ان کے انتقال سے غم زدہ اور سوگوار ہیں، ان کی ذات بڑی فیض بخش تھی، اور ان کے دریائے کرم اور جود و سخا کی بارش عام تھی، اس لئے ان کے غم میں سب کی آنکھیں اشک بار ہیں ع عَمَّتْ فَوَاضِلُهٗ فَعَمَّ مُصَابُهٗ۔

اب ان کے بھائی عبداللہ بن عبدالعزیز نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے، اور لوگوں نے ان سے بیعت کر لی ہے، انہوں نے اپنے بھائی سلطان بن عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کیا ہے جو اس وقت تک دفاع اور سیاحت کے وزیر تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی قوت دے اور ان کی مدد کرے، ملک فہد کی تدفین منگل کے روز ۲/اگست کو ہوئی جس میں دنیا کے اکثر ملکوں کے سربراہوں اور نمایندوں نے شرکت کی، ہندوستان سے بھی ایک وفد جنازے میں شریک ہوا تھا۔

ملک فہد ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، ۲۷ برس کی عمر میں حکومت کے بعض عہدے اور ذمہ داریاں ان کو سپرد کی گئیں، ۱۹۵۳ء میں انہیں سعودی عرب کا پہلا وزیر تعلیم بنایا گیا، اس سے پہلے ملک کی تعلیمی حالت بہتر نہیں تھی، انہوں نے ہمہ گیر نظام تعلیم قایم کر کے اپنی غیر معمولی لیاقت

وقابلیت اور خوش انتظامی کا ثبوت دیا، محکمہ تعلیم میں متعدد اصلاحات کیں، تعلیم کو فروغ دیا، عصری اور پروفیشنل تعلیم کو رواج دیا، جن سے دوسرے ممالک کے طلبہ بھی مستفید ہورہے ہیں، پہلے درس گاہوں کی تعداد بہت کم تھی، ان کے دور میں ۷ یونیورسٹیاں ۸۳ کالج اور ۱۸ ہزار اسکول قایم ہوئے، جن میں ۳۵ لاکھ طلبہ تعلیم پارہے ہیں، شہروں کی طرح دیہاتوں کے لوگوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔

۱۹۶۲ء میں انہیں وزارت داخلہ سپرد کی گئی، ۱۹۷۵ء میں ملک فیصل کے بے رحمانہ قتل کے بعد جب ملک خالد سربراہ مملکت ہوئے تو یہ ولی عہد مقرر کئے گئے، ۱۹۸۲ء میں ملک خالد کی وفات کے بعد ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی، ڈپٹی پرائم منسٹر بھی رہے، بیچ بیچ میں وزارت کی ذمہ داریاں بھی انجام دیں اور بعض ملکوں میں ہونے والی تقریبات اور میٹنگوں میں سعودی عرب کی نمایندگی کی۔

ملک فہد کی حکومت کے زمانے میں سعودی عرب تیل کی دولت سے مالا مال تھا، انہوں نے اس کے اور بعض دوسرے رونما ہونے والے واقعات اور پیچیدہ مسایل کی گتھیاں ہوش مندی اور تدبیر سے سلجھائیں، ان کے دور میں ملک میں خوش حالی آئی، تعمیر وترقی اور رفاہ عام کے گوناگوں کام انجام پائے، سفر کی سہولت کے لئے وسیع اور کشادہ سڑکوں کا جال بچھادیا، ٹریفک کی وجہ سے زمین دوز راستے اور سرنگیں تعمیر کرائیں، عرب جیسے بے آب وگیاہ ملک میں بجلی اور پانی کی ایسی فراوانی ہے کہ ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کا نظام بہتر سے بہتر کرادیا، علاج کے لئے شفاخانے تعمیر کرائے، ملک کی معیشت کو ٹھوس اور بہتر بنانے کے لئے متعدد مفید اقدامات کئے، کرنسی کو گرنے اور افراط زر کا اثر نہیں آنے دیا، انڈسٹریاں قایم کیں، بینکنگ سسٹم کو رائج کیا، زراعت وتجارت کو فروغ دیا، تیل کی پیداوار میں اضافہ کیا، ملک کو خوش حال، ترقی یافتہ، پرامن اور فلاحی اسٹیٹ بنانے کے لئے مختلف منصوبے اور اسکیمیں بنائیں، اس کا دفاعی اور حفاظتی نظام مستحکم کیا، شہروں کی تزیین وآرایش کا اہتمام کیا، جدہ کو بہت خوبصورت شہر اور ایسا مارکیٹ بنایا جہاں ضرورت کی ہر چیز مناسب قیمت پر مل سکتی ہے، غرض سعودی عرب کو مشرق وسطی کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید طرز کا ملک بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

ملک فہد کا سب سے زریں کارنامہ حرمین شریفین کی تعمیر میں توسیع وتزیین ہے، حرم کی توسیع دوبارہ کراچکے تھے، اور اب تیسری بار بھی ان ہی کے حکم سے توسیع کا کام شروع ہوا ہے،



حرمین کی صفائی، ستھرائی اور نظافت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ کہیں ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا، حجاج کو راحت وسہولت بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے تھے، ان کی سہولت کے لئے قرآن مجید کے نسخے اور ٹھنڈے آب زمزم کے برتن مناسب جگہوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں، عالم اسلام کے بہت سارے لوگوں کو سعودی عربیہ اور اس کے مختلف اداروں کی جانب سے حج کرانے کے لئے مدعو کرتے اور انہیں اپنا میزبان بناتے، اکثر ممتاز لوگوں کی ضیافت شاہی محل میں کراتے اور انہیں ملاقات کا شرف بخشتے۔

ملک فہد کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کے نسخوں کی عمدہ اور خوب صورت طباعت اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجموں کی اشاعت ہے، جن کو ہر ہر ملک میں تقسیم کرانے کا اہتمام کیا، خوب صورت اور پاکیزہ مسجدیں بھی پورے سعودی عرب اور بلاد اسلامیہ میں تعمیر کرائیں، ان کی توجہ سے خاص طور پر مغربی ملکوں میں اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں، مغربی ملکوں اور اکثر دوسرے ملکوں کے مدارس کی وہی سرپرستی فرماتے تھے، اور ان کے اخراجات کے متکفل ہوتے تھے، دنیا کا کوئی ملک قدرتی آفات میں مبتلا ہوتا تھا تو وہ اس کی دل کھول کر مدد کرتے تھے، خدمت خلق میں ان کو لطف ملتا تھا، نہ صرف سعودی عرب بلکہ دنیا بھر کے ملکوں کے غریب اور نادار مسلمانوں کے لئے ان کا دریائے کرم ہمیشہ بہتا رہتا تھا۔

ملک فہد پر آیندہ کتابیں لکھی جائیں گی تو ان کی سیرت وکردار کی عظمت اور تدین اور پاک بازی کے جلوے بھی سامنے آئیں گے، حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے ممکن ہے ان میں شاہانہ خوبو رہی ہو مگر حکومت کا کاروبار سنبھالنے کے بعد شاہانہ جاہ وجلال اور رعونت کا کوئی اثر ان کی زندگی میں نہیں دکھائی دیتا، وہ نہایت متواضع اور عجز وانکسار کے خوگر تھے، اپنے کو خادم الحرمین الشریفین کہلانا پسند کرتے تھے، عام بادشاہوں کی طرح ان میں مطلق العنانی بالکل نہیں تھی، صرف مملکت کی فلاح وبہبود، سعودی عرب کے عوام کی خدمت اور نفع رسانی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی امداد واعانت ان کے پیش نظر رہتی تھی، وفات کے بعد بھی ان کا کوئی سوگ نہیں منایا گیا، معمولی آدمیوں کی طرح عام قبرستان میں دفن کئے گئے۔

ملک فہد اور آل سعود دین داری، عقاید کی پختگی، تصور توحید کی صحت، کفر وشرک کی

بیزاری اور بدعات و محدثات سے اجتناب کے لئے مشہور ہیں، محمد بن سعود کا تعلق مشہور مصلح و داعی شیخ عبدالوہاب نجدی سے تھا، شیخ نے جس زمانے میں توحید خالص اور احیائے سنت کی تحریک شروع کی، اس زمانے میں نجد کے امیر محمد بن سعود تھے، انہوں نے شیخ کی اصلاحی تحریک کا پورا ساتھ دیا اور جب تمام عرب ان کے زیر اقتدار آگیا تو توحید خالص اور دین صحیح کا وہاں غلغلہ مچ گیا، شرک و بدعت کے تمام مظاہر و علامات منادی گئیں، پختہ قبریں منہدم کردی گئیں، اور اب سعودی حکم رانوں اور دوسرے بڑے بڑے لوگوں کی قبریں بھی سادے انداز کی بنائی جانے لگیں، چنانچہ ملک فہد بھی عام قبرستان میں دفن کئے گئے۔

سیاسی محاذ پر بھی ان کی حکمت عملی اور سیاسی بصیرت سے ان کے پورے ملک کو فائدہ پہنچا اور بعض مشکل مسائل کو حل کرنے میں وہ کامیاب رہے، عرب و اسرائیل اختلافات ختم کرانے اور فلسطین کا قضیہ حل کرانے میں انہوں نے بڑی جد و جہد کی، کویت کو عراق کے جارحانہ قبضے سے آزاد کرانے میں ان کا حصہ بہت نمایاں تھا۔

ملک فہد کے زمانے میں عراق و ایران کی برادرانہ جنگ کا جس میں امریکہ ہی کا ہاتھ بتایا جاتا ہے، بعد از خرابی بسیار اختتام ہوا، اس میں سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ملکوں نے دل کھول کر عراق کی مدد کی تھی، جس کا صلہ صدام حسین نے یہ دیا کہ کویت پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلینا چاہا جس کو امریکہ نے ناکام کردیا تھا، لیکن اب عراق کا خطرہ مستقل ہوگیا تھا، اس کی وجہ سے سعودی عرب کو ارض مقدس میں امریکی افواج کے قیام کی اجازت دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا، اس کی اس مہمان پروری کا نتیجہ یہ نکلا کہ　ع　جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہوگئی

یہ دنیا کے مسلمانوں کی خلش اور بے چینی کا باعث ہوئی، ان کے خیال میں تثلیث کے فرزندوں نے میراث خلیل کو ہتھیا لینے کے لئے یہ سازش رچی ہے، اس کے بعد ہی سے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کا نام دفعتاً سنائی دینے لگا، نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی کوئی حقیقت بھی ہے یا میڈیا کے بل بوتے پر ان کی حقیقت تسلیم کرائی جارہی ہے تاکہ مسلم ممالک کو ایک ایک کرکے تاراج کردیا جائے چنانچہ دو مسلم ملکوں کو زیر و زبر کرنے کے بعد اب "امن عالم" کے سب سے بڑے ٹھیکہ دار کے نشانے پر تیسرا اسلامی ملک آگیا ہے۔



ابھی تک سعودی عرب امریکی دست درازی اور تعدی سے محفوظ ہے، لیکن یہ عارضی ہے یا پائیدار یہ تو وقت بتائے گا، مگر دفاع و تحفظ کے نام پر امریکی فوجوں کی موجودگی ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے، جس کا اثر خاص طور پر مملکت کی معیشت پر دکھائی دیتا ہے، اخراجات اتنے بڑھتے جارہے ہیں کہ عوامی مفاد کے بہت سے ضروری اور ترقیاتی کام اور رعایتیں ختم کردی گئی ہیں، ملک و بیرون ملک کے مختلف نوعیتوں کے کام انجام دینے والوں کی تعداد میں تخفیف ہوتی جارہی ہے، اس کی وجہ سے امریکی افواج کی موجودگی کو نہ عرب عوام نے پسند کیا اور نہ دنیا کے مسلمانوں نے ان کی ناراضگی اور بے چینی کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً ہوتا ہے، وہ خود بھی امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو ناپسند کرتے تھے، اس نے افغانستان اور عراق کو تہس نہس کرکے جس طرح وہاں اپنا مستقل مسکن بنالیا ہے اور عراق کے تیل کے کنووں پر اپنا پنجہ گاڑ دیا ہے، اس سے وہ گھٹن محسوس کرتے تھے، امریکہ دونوں ملکوں میں شیعہ سنی اختلافات بھڑکا کر اور دوسرے گروہوں میں بھی انتشار پیدا کرکے وہاں اپنی فوجوں کے قیام کی گنجائش نکالے ہوئے ہے، یہ سب شاہ کی طبیعت پر بھی بار بن گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے خلاف عراق و افغانستان میں جو نفرت اور بیزاری پائی جاتی ہے یا وہاں کے لوگ جس تشدد پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں اس کے ختم ہونے کی صورت یہی ہے کہ امریکہ اپنی جارحیت سے باز آئے اور عراق و ایران اور مسلم ملکوں سے اپنی فوجیں واپس بلا لے اور انہیں آزادی اور اپنی مرضی سے رہنے دے۔

تاہم فرماں روائے عرب اور پاسبان حرم کی وفات دنیا کا بڑا حادثہ اور امت مسلمہ کا سخت خسارہ ہے، ان کی دینی و اصلاحی خدمات گوناگوں تھیں، وہ قرآن مجید کے خادم اور متبع سنت تھے، ان کو دین و شریعت کے نفاذ، کتاب و سنت کی نشر و اشاعت، علم دوستی، علما نوازی، خدمت خلق، غربا پروری اور اہل اسلام کی ہم دردی و اعانت کے لئے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

اللہ تعالی ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل دے، سعودی عرب اور دنیائے اسلام کو ان کا بدل عطا کرے، ارض حرم کو محفوظ رکھے اور ملک فہد پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔

اللھم صبب علیه شآبیب رحمتک واغفرله ۔　"ض"

# آہ ! ڈاکٹر رفیق زکریا

افسوس ہے کہ ۹ر جولائی کو ڈاکٹر رفیق زکریا نے ممبئی میں داعی اجل کو لبیک کہا، اِنَّـا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ مشہور عالم، دانش ور اور ممتاز مصنف اور اسکالر تھے، ان کا شمار مسلمانوں کے لائق، قابل، صاحب کمال مدبر اور عالی دماغ لوگوں میں ہوتا تھا، وہ بڑے غور وفکر کے بعد بالغ نظری سے حالات وواقعات اور مسایل کا تجزیہ کرکے صحیح رخ اور سمت کا تعین کرتے تھے، ان کے استنباط اور بحث کے نتائج سے اختلاف کرنے والے بھی ان کی بصیرت، دیدہ وری، دقت نظر اور باخبری کا اعتراف کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کا خلا شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا، جس سے سخت بے چینی اور سینے اور کمر میں بڑی تکلیف تھی، ابھی اسپتال لے جانے کی تیاری ہی ہورہی تھی کہ وقت موعود آگیا، ان کا آبائی وطن اورنگ آباد تھا، یہاں وہ اپریل ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے تھے، یہ تقسیم سے پہلے ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا، لسانی جارحیت اور اردو دشمنی نے ریاست حیدرآباد کے تمام اضلاع کو انڈین یونین کی کئی ریاستوں میں اس طرح منقسم کردیا کہ اردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہ بننے پائے، چنانچہ اورنگ آباد اب مہاراشٹر میں شامل ہے، مرحوم کو ان کی وصیت کے مطابق یہیں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اورنگ آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ممبئی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور چانسلر گولڈ میڈل حاصل کیا، ڈاکٹریٹ کی ڈگری لندن یونیورسٹی سے حاصل کی اور بار ایٹ لا لنکنز ان سے کیا، واپس آکر وکالت شروع کی، طالب علمی ہی کے زمانے میں سیاست کی خارزار سے الجھ گئے اور طلبہ کے لیڈر بن کر ابھرے، ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں طلبہ کی قیادت کی اور گرفتار کئے گئے، پھر باقاعدہ کانگریس میں شامل ہوئے اور سرگرم سیاست میں حصہ لیا، اس کے ٹکٹ پر اورنگ آباد سے برابر صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوتے رہے، ۲۵ برس تک مہاراشٹر کابینہ کے رکن



اور مختلف وزارتوں پر فائز ہوئے، چار برس تک راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیرمین رہے، اپنی خداداد قوت گویائی، سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کی بنا پر کئی بار اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمایندگی کی۔

ڈاکٹر رفیق زکریا لکھنے پڑھنے میں اچھے اور مطالعہ کے شوقین تھے، قومی، سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ان کے مطالعہ وتحقیق میں مانع نہیں ہوئیں اور صحافت، علم وادب اور مطالعہ سے ان کا اشتغال قایم رہا، آخر میں سیاست کے گرتے ہوئے معیار اور اس میں بڑھتی ہوئی بدعنوانی دیکھ کر وہ سرگرم سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کرکے علمی وتحقیقی کاموں ہی کے لئے وقف ہوگئے اور ان کی تصانیف اور عالمانہ مقالے اصحاب نظر سے خراج تحسین وصول کرنے لگے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کی شناخت ایک سیکولر اور روشن خیال مسلمان صاحب علم ونظر کی ہے، وہ واقعات وحالات کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنے کے عادی تھے، ان کی بحث ونظر کا انداز معروضی ہوتا تھا، وہ جب اہل مغرب اور متعصب ہندوستانی مورخین کو اسلام اور مسلمانوں کی غلط ترجمانی اور اصل رنگ میں پیش نہ کرنے کا جواب دیتے اور صحیح پس منظر سامنے لاکر اسلام کی اصلی اور حقیقی تصویر پیش کرتے تو کہا جاتا کہ انہوں نے جنت میں اپنی جگہ بنالی، چنانچہ رسوائے زمانہ سلمان رشدی کا ناول "شیطانی آیات" شایع ہوا، جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر رسول اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کی شان میں نہایت بے ہودہ اور نازیبا باتیں کہی گئی ہیں، تو ڈاکٹر صاحب نے خالص علمی اور معروضی انداز میں اس کا نہایت مدلل جواب "محمد اور قرآن" کے نام سے لکھا، اور رشدی کے پیش کردہ واقعات ونتائج کو اصل مآخذ سے مقابلہ کرکے اس کے جعل وفریب کا پردہ چاک کردیا، اسی طرح انہوں نے اقبال کو فرقہ پرست کہنے والوں کا بہت مدلل اور عالمانہ جواب دیا۔

اس طرح کی کتابوں کی وجہ سے وہ اسلامی اسکالر اور اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے ہیں، لیکن جب وہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی قومی وملی فکر اور تحریکوں اور سیاسی زندگی کے نشیب وفراز کے جائزے کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی وقومی زندگی کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے ہیں تو مسلمانوں کا وہ طبقہ جس کی گہری نظر گزشتہ حالات ومسایل پر نہیں ہے، اور جو حقایق وواقعات سے قطع نظر کرکے محض جذباتی انداز میں بحث وتجزیہ کا عادی ہے، وہ ڈاکٹر

صاحب کو تجدد پسند قرار دے کر ان کی تنقیص کرتا ہے اور ان کی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، مثلاً ۱۹۹۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر "سردار پٹیل اور ہندوستانی مسلمان" کے عنوان سے انہوں نے دہلی کے نیشنل میوزیم آڈیٹوریم میں جو لکچر دیئے اور جن کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے، تو اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، کیوں کہ سردار پٹیل کی زیادہ شہرت مسلم دشمن کی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے منطقی و معروضی انداز میں ان کی تصویر کے دونوں رخ پیش کئے ہیں، انہوں نے جہاں یہ دکھایا ہے کہ سردار پٹیل نے بہت سے کام مسلمانوں کے مفاد میں کئے ہیں، وہ تحریک خلافت کے حامی تھے، بابری مسجد کے معاملے میں ان کا رویہ فرقہ پرستانہ نہیں تھا، لیکن جب دوسرا پہلو بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملے میں ان کا موقف سخت تھا، وہ ان پر طعنہ زنی کرتے تھے، کانگریس کا ساتھ نہ دینے کو ناقابل معافی سمجھتے تھے، مسلم لیڈروں سے بے تکے سوالات کرتے تھے، اور بے رحمانہ انداز اختیار کرتے تھے اور اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سردار دو قومی نظریہ اور تقسیم کے شدید مخالف تھے، ان کو تقسیم کے وقت مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا صحیح انداز نہیں تھا، اسلام سے ان کی واقفیت واجبی تھی۔

یہ دونوں رخ پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ پٹیل ایک سیکولر اور اصول پسند شخص تھے، اگر مسلم دوست نہیں تو مسلم دشمن بھی نہیں تھے، بعض دوسرے لیڈروں کی طرح ان کا یہ خیال تھا کہ "جواہر لال کے مقابلے میں سردار پٹیل اچھے وزیر اعظم ہوتے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس معاملے میں اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا" اب چاہے کسی کو ان کے اس نتیجے سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن انہوں نے تجزیہ کرنے میں معروضی اور غیر جانب دارانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب "ہندوستانی مسلمان: انہوں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے" شائع ہوئی ہے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جذبات میں آکر تقسیم کا نعرہ بلند کیا جو تاریخی غلطی ہے اور جس کا خمیازہ وہ بھگت رہے ہیں، لیکن اب انہیں حقایق کا سامنا کرنا، ان سے ہم آہنگ ہونا اور اپنی دنیا آپ بنانا چاہئے، اس کتاب کا مقصد بھی واقعات و حقایق پیش کر کے لوگوں کو صحیح نتایج اخذ کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سیکولر مسلمان اور حقیقت پسند شخص تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی



یک جہتی و ہم آہنگی کے قایل تھے، مسلمانوں کو اپنی پہچان بنائے رکھنے کے ساتھ ہی اپنے اندر روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا کرنے اور قومی زندگی سے کنارہ کش نہ رہنے کی تلقین کرتے تھے، اور رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں کی جانب سے ان پر جو ناروا اور غیر ذمہ دارانہ اعتراضات کیے جاتے تھے، ان کا مسکت جواب بھی دیتے تھے، اسلام، اسلامی تاریخ، ہندوستانی اور مسلم سیاست پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے ان کے جواب میں بڑا وزن ہوتا تھا۔

اوپر جن کتابوں کا ذکر آیا ہے ان کے علاوہ بھی انہوں نے کئی اہم اور قابل قدر کتابیں لکھیں، رضیہ سلطان اور انڈین نیشنل کانگریس کی صد سالہ تاریخ پر ان کی کتابوں کو اعتبار حاصل ہوا، نہرو، جناح اور بے نظیر بھٹو کی شخصیتوں کا مطالعہ و تجزیہ بھی پیش کیا، فرقہ واریت اور ہندو مسلم منافرت کے وہ ہمیشہ مخالف رہے، ان کی کتاب The Widening Divide اس کا ثبوت ہے جس کا اردو ترجمہ "بڑھتے فاصلے" کے نام سے ہوا ہے، ایک کتاب میں گجرات فسادات کے بعد بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جذبات اور نظریات کا جایزہ لیا ہے اور اس پر تشویش ظاہر کی ہے، ابھی حال میں لال کرشن اڈوانی نے پاکستان کے دورے میں مسٹر جناح کی تعریف میں جو بیان دیا تھا، اس پر برہمی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مسٹر اڈوانی نے دو قومی نظریے، ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے تشدد کی حمایت کی ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کو انگریزی میں بڑی مہارت تھی، ان کی اصل تصنیفی زبان یہی تھی، اردو میں بھی کتابیں لکھیں ان کی تمام کتابیں ان کے عمیق مطالعہ و تحقیق اور علم و نظر کی وسعت کا ثبوت ہیں، اسی لئے اکثر انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب منجھے ہوئے اور مشاق اہل قلم ہی نہیں تھے، بڑے اچھے اور خوش بیان مقرر بھی تھے، اردو اور انگریزی دونوں میں پر مغز اور معلومات افزا تقریریں کرتے تھے، اکثر اداروں اور سمیناروں میں تقریروں کے لئے مدعو کیے جاتے اور اپنا جوہر دکھاتے، راقم کو بھی دو بار ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا، غالباً ۱۹۹۰ میں سابق وزیر اعظم مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے منڈل کمیشن پر اظہار خیال کے لئے دانشوروں کی ایک میٹنگ بلائی تھی، اس میں پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی اور ان کی بصیرت افروز تقریر سنی، دوبارہ ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے علامہ شبلی سمینار میں "علامہ شبلی کے عہد،

اس کے تقاضوں کے لحاظ سے ان کا طریقۂ عمل اور سرگرمیاں'' پر ان کی مبسوط تقریر ہوئی جس سے اس عہد کی تاریخ پر ان کی گہری نظر کا اندازہ اور یہ معلوم ہوا کہ وہ علامہ شبلی اور دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف اور ان کی خدمات اور کارناموں کے قدرداں تھے، اسی تعلق کی بنا پر انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا کی دعوت پر ۲۰۰۰ء میں حارث سیرت لکچر دینے گیا تو انہوں نے خواہش کی کہ یہ کم مایہ رشدی کے جواب میں ان کی کتاب کے اجرا کی رسم ادا کرے، وہ اپنی علالت کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کرسکے تھے، ورنہ عرض کرتا کہ

غبار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال    خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے

ڈاکٹر رفیق زکریا کا تعلق جامعہ اردو سے گہرا تھا اور انہوں نے اردو اور تعلیم کے فروغ کے لئے سعی بلیغ کی، اسکول کے علاوہ ۱۵ کالج قایم کیے، ان کے ذریعے غریب اور پس ماندہ طبقے کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، ان کا گھرانا بھی اعلا تعلیم یافتہ تھا، ان کی بیگم فاطمہ صحافی اور سنڈے ٹائمز آف انڈیا کی اڈیٹر تھیں، ایک صاحب زادے فرید امریکہ کے ایک وقیع رسالہ نیوز ویک انٹرنیشنل کے اڈیٹر ہیں، دوسرے بیٹے ارشد امریکہ کے ایک بڑے مالیاتی ادارے کے چیف اگزیکیوٹیو ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس زمانے میں عصری تقاضوں کو نظر انداز کرکے اسلام کی تعبیر و ترجمانی کا حق ادا نہیں ہوسکتا، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان جن سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسایل سے دوچار تھے، اس سے وہ پوری طرح باخبر تھے اور اس میں وہ ان کی فکری رہنمائی برابر کرتے تھے، اور ملک کے دوسرے باشندوں کو بھی وہ ان کے حالات و مسایل سے واقفیت بہم پہنچاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے چشم پوشی کرے، انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین !! ''ض''

---

## یاد رفتگاں

از: سید سلیمان ندوی

یہ حضرت سید صاحب کی ان غم ناک تحریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے اساتذہ احباب اور دوسرے معاصر مشاہیر کی وفات پر لکھی تھیں۔ قیمت ۷۵ روپے



# ادبیات

## غزل

از: پروفیسر محمد ولی الحق انصاری٭

کہنا ہے الوداع تجھے قصر تن کبھی    جانا ہے اس دیار سے مجھ کو وطن کبھی

پرواز میری روک سکیں گے نہ رنگ و بو    اڑ جائے گا چمن سے یہ مرغ چمن کبھی

اے مشت خاک! ساتھ مرا دے گی تا کجے    جانا ہے زیر خاک تجھے اے بدن کبھی

بالیدہ جان ہوگی تو چھوٹا پڑے گا جسم    ہوگا دریدہ روح کا یہ پیرہن کبھی

شمشیر و جام زہر سے ہوں گا نہ میں ہلاک    مجھ کو کریں گے ختم نہ دار و رسن کبھی

اس جسم عنصری سے جدا ہے مرا وجود    مجھ کو نہ ہوگی حاجت گور و کفن کبھی

دنیا میں رہ کے ہی میں اسے کیوں نہ چھوڑ دوں    آخر تو چھوٹنا ہی ہے یہ انجمن کبھی

غم ہے یہی کہ مجھ کو نہ پہچان پایا شیخ    اور ساتھ ہی سمجھ نہ سکا برہمن کبھی

تشکیک کے فریب مت آئیو ولی
بدلے نہ بدگمانیوں سے حسن ظن کبھی

## در اقتفائے حافظ شیراز

از: ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی٭٭

ای خرابات دل و جان ہا در ایوانِ شما    باز تشنہ لب ہمی گردند رندانِ شما

طالبان حسن را با وصل و با ہجران چہ کار    بس بود بہر دلِ ما، سحر پیمانِ شما

گر نمی خواہد رہائی نیست جای حیرتی    یوسفی کو ہست بی جرمی بہ زندانِ شما

دیدہ و دل، جسم و جان، احساس و افکار لطیف    ہر چہ دارم، ہست از انعام و احسانِ شما

کی رسد یارب بہ ساحل زورقِ اندیشہ ام    آنکہ خود در جستہ از دستم بہ طوفانِ شما

در شہادت گاہِ الفت، بی گنا ہم کشتہ اید    صد سپاس و شکر و منت، ردِ احسانِ شما

---

٭ دارالامان ۷۰ ؍ ۲ فرنگی محل، لکھنؤ۔ ٭٭ مکان نمبر ۱۱۸ ؍ ۴، آلو کو کالونی، نئی آبادی، علی گڑھ

آب از جو رفتہ باز آید بہ جو، بشنیدہ اید؟ | چون بہ عقل خویش باز آیند مستانِ شما
چارہ سازان بر مرادِ خود چسان نایل شوند | درد، درد ماست، درمانست، درمانِ شما
تا بہ کی شبہائی امیدم نبیند روی صبح | ای کہ مہر و ماہ می گردد بہ فرمانِ شما
گر بتابد پرتوی از نور، در کاشانہ ام | کم نگردد تابشی از روی تابانِ شما
قلب زارم ہم بہ امید قضاوت می تپد | قضیہ با فیصل ہمی گردد بہ دیوانِ شما

این رئیس بے نوا ہم با نوا گردد اگر
راست آید کارکی در عہد چشمانِ شما

## غزل

از: جناب وارث ریاضی صاحب*

غلط کو میں نے کبھی سچ نہیں کہا اے دوست | یہی خطا ہے کہ سب لوگ ہیں خفا اے دوست
گئے ہیں جان سے انساں ہزارہا اے دوست | تری خرد نے کیا ہے یہی عطا اے دوست
فغانِ درد و ستم شورشِ قیامت کا | تری گلی سے گزرتا ہے راستا اے دوست
ستم کے باب میں تیرا کوئی جواب نہیں | وفا کی خُو جو نہیں ہے تو کیا ہوا اے دوست
تری خوشی سے ملی ہے جہاں کی خوشنودی | خفا ہوئے تو زمانا ہوا خفا اے دوست
ترے حسین تصور میں کھو گیا ایسا!! | کہ ہر حجاب نگاہوں سے اٹھ گیا اے دوست
گلوں میں، قطرۂ شبنم میں، چاند تاروں میں | ترا جمال فروزاں ہے کیف زا اے دوست
عجیب بات ہے سب اجنبی سے لگتے ہیں | وہ غیر ہوں کہ عدو ہوں کہ آشنا اے دوست
نہ جانے منزلِ مقصود ہے کہاں اس کی | رواں دواں ہے ابھی غم کا قافلا اے دوست
مرے جنوں پہ یہ الزام بے بسی ہے غلط | کہ تیرے جور کے قابل نہیں رہا اے دوست
ستم شعار بھی ہے شاکیٔ غم دوراں | غضب کی چرخ کہن چال چل گیا اے دوست

جہانِ عشق میں وہ خوش نصیب ہے وارث
کہ تیرے غم سے جسے اُنس ہو گیا اے دوست

---

* کاشانۂ ادب، سکلا دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔



# مطبوعات جدیدہ

**عصر حاضر کے مسائل ان کا حل اور مسئلہ اجتہاد: از ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی**

متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت مجلد صفحات ۳۶۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱ حوض سوئی والان، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اجتہاد کیا ہے؟ شریعت میں اس کی ضرورت اور اہمیت کس درجہ ہے؟ اسلامی تاریخ میں اس کے نقوش کیسے روشن ہیں؟ روح اجتہاد کی پژمردگی کے اسباب کیا ہیں اور موجودہ دور میں اس کے احیاء کی مساعی کتنی موثر ہیں؟ ان تمام سوالوں پر زیر نظر کتاب میں غور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بڑی حد تک یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہے، چار خاص ابواب میں پہلا، نفس موضوع یعنی مسئلہ اجتہاد کے لیے خاص ہے لیکن اس سے پہلے ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں شریعت اور اس کی بنیادوں پر سیر حاصل تبصرہ ہے، قرآن و حدیث کے علاوہ اجماع، قیاس، استحسان، استصلاح، عرف و رواج، سد ذرائع، استصحاب وغیرہ جیسے شریعت کے ثانوی ماخذ پر جامع گفتگو سے اصل بحث یعنی مسئلہ اجتہاد کی تفہیم میں بڑی آسانی ہوگئی ہے، یہ حقیقت ہے کہ اسلام زندہ مذہب ہے اور شریعت اور اسلامی قانون اس زندگی کو تب و تاب جاودانہ بخشتے ہیں اور اس کا نہایت اہم محرک عمل اجتہاد ہے جس نے قرآن و سنت کے بظاہر محدود لیکن درحقیقت انتہائی وسیع معانی کی تلاش اور ادراک کو سہل الحصول بنادیا، لائق مولف کا خیال ہے کہ اجتہاد کے عمل سے اسلامی تاریخ کا کوئی دور بالکل خالی اور محروم نہیں رہا، خیر القرون کے بعد اب اگر اجتہاد کی کارفرمائی کم نظر آتی ہے اور جس کا شکوہ شد و مد سے کیا جاتا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ بعد کے زمانے میں چونکہ اجتہاد کی شرطیں زیادہ ہوتی گئیں اور معاشرے میں تغیر و تبدل کی رفتار بھی سست رہی اس لیے مجتہدین بھی نسبۃً کم ہوئے لیکن یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد جس

شدت وسرعت سے حالات بدلتے رہے اس نے شریعت کے سامنے بھی روز افزوں مسائل کا انبار لگادیا اور یہ احساس بھی بیدار کیا کہ اجتہاد کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے اور اس ضرورت کے پیش نظر ہندوستان اور عالم اسلام میں ایسے کئی ادارے قایم ہوئے جن کی سنجیدہ کاوشوں نے اجتہاد کے گویا بند دروازوں کو کھولنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، لائق مصنف نے اس کی تفصیل بھی پیش کی ہے، مجموعی لحاظ سے اپنے موضوع پر یہ مفید کتاب ہے، گرچہ کار اجتہاد کے بند ہونے یا کم ہونے کے اسباب اور اثرات کے بیان میں تشنگی محسوس ہوتی ہے، محض یہ کہنا کافی نہیں کہ قریب چھ سات سو سال تک چوں کہ حالات کم تغیر پذیر تھے، اس لیے اجتہاد کی رفتار بھی سست رہی، تقلید کی گرم بازاری کچھ اور بیان کرتی ہے، فتاویٰ عالم گیری کو اجتماعی اجتہاد کی مثال قرار دینا بھی محل نظر ہے، خود مصنف کی عبارت ان کے دعوے کو رد کرتی ہے کہ ''علما اور فقہا کی ایک جماعت نے فقہ حنفی کے مفتی بہ مسائل کو فقہی ابواب کی ترتیب سے یکجا مرتب کیا'' موجودہ دور میں انفرادی کی جگہ اجتماعی اجتہاد کے عملی اور مناسب ہونے میں مضائقہ نہیں، لیکن اس کے لیے اجتہاد کی شرطوں اور مطلوبہ خوبیوں میں ذرا بھی کوتاہی بجائے حل کے، بحران سے دو چار کر سکتی ہے۔

ریاض السالکین ملقب بہ گلدستہ اذکار: مرتبہ: جناب مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۳۹۲، قیمت ۱۲۰/روپے، پتہ : مکتبہ دار المعارف، بی۹/۶۳ وصی آباد، الہ آباد۔

ادعیہ ماثورہ، اوراد و وظائف و اعمال پر مشتمل یہ جامع کتاب، فاضل مولف کی اقوال سلف، وصیۃ الآداب، روح البیان اور تربیت اولاد کا اسلامی نظام جیسی مفید و نافع تالیفات کا ایک اور حصہ ہے، گو یہ پہلے بھی مختصراً شایع ہو چکی ہے لیکن زیر نظر ایڈیشن، بزرگوں کی تالیفات سے اخذ و استفادہ کے بعد نئی ترتیب اور نئے عنوانات سے زیادہ کامل شکل میں آراستہ کر کے شایع کیا گیا ہے، یعنی اس میں امام نووی کی کتاب الاذکار اور مولانا تھانوی کی مناجات مقبول کے انتخاب کے ساتھ اردو و فارسی کی بعض موثر منظوم دعائیں ہیں، نماز جمعہ و عیدین اور باقی نوافل و مستحبات نمازوں کے ضروری مسائل و فضائل بھی شامل کئے گئے ہیں، یہ درست



ہے کہ یہ مشائخ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بھی اضافی خوبیوں کی حامل ہے، دعاؤں کے ترجمے اور ان کی توضیح وتشریح بھی دلکش انداز میں ہے، اس طرح یہ مجموعہ عوام وخواص دونوں کے لیے کارآمد ہوگیا ہے۔

اودھ کے فارسی گوشعراء (۱۷۲۱ تا ۱۸۵۶): از ڈاکٹر زہرہ فاروقی متوسط تقطیع عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۳۶۸، قیمت ۲۰۰/روپے، پتہ: ڈی۔ ۱۷۸۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

اودھ کی تاریخ کا ہر پہلو اس خطے کی طرح بڑا خوبصورت، جاذب نظر اور دلکش ہے اور اس کی داستان ہمیشہ دلچسپی کا سبب بنتی ہے، زیر نظر کتاب بھی داستان اودھ کا ایک اور دلچسپ باب ہے، جس میں اس سرزمین کے ان شعراء کا تذکرہ ہے جنھوں نے فارسی زبان میں شعر وسخن کی شمعیں روشن کیں، ایسے قریب سو شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کو سلیقے سے یکجا کردیا گیا ہے، اودھ کی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ خصوصاً یہاں کے نوابوں کے احوال پر خاص معلومات فراہم کیے گئے ہیں، اصلاً یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اور مقالہ نگار نے اس کا حق بھی ادا کیا ہے، البتہ طباعت کی تصحیح میں کمی رہ گئی ہے، مثلاً باب پنجم کی سرخی ہے ''نوابین اودھ کی چند اہم فارسی تصنیفات'' یہاں شروع میں دور کا لفظ رہ گیا اور یہ فہرست میں لکھا بھی ہے، مقالہ تحقیقی ہے لیکن مقالہ نگار کی انشاپردازانہ صلاحیت کا اظہار بھی جابجا ہوتا ہے، مثلاً مقدمہ کا پہلا جملہ ہی اس طرح ہے کہ '' خطہ اودھ کی حیات بخش آب وہوا میں ایک ایسی نرگی حل تھی جس کے ایک لمس نے تہذیب کے ہر گوشے کو مجلّا ومشفا (؟) کردیا''۔

اشفاق اللہ خاں شہید (حیات وافکار): از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۳۵۰، قیمت ۲۳۰/روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

تحریک آزادی کی تاریخ میں کاکوری کیس اس لحاظ سے اہم ہے کہ عدم تعاون اور عدم تشدد کے سیاسی حربوں کی بجائے یہ ایک براہ راست پرتشدد اور جنگ جویانہ قدم تھا، جس سے انگریز حکمرانوں کی سراسیمگی میں یقیناً اضافہ ہوا، اس واقعہ میں اشفاق اللہ خاں بھی شریک وشہید

ہوئے، ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں میں ان کا شمار ہوا لیکن آزادی کے بعد ان کے لہو کا رنگ پھیکا پڑتا گیا، ان کی شخصیت اور کارناموں کو یاد رکھنے کی ضرورت تھی، شاید اسی احساس نے فاضل مولف کو اس مفید کتاب کی تدوین کے لیے آمادہ کیا، وطنی نسبت نے بھی اس کو مہمیز کیا، فاضل مولف نے اس سے پہلے بھی مولانا آزاد، مولانا سندھی، شیخ الاسلام اور شیخ الہند کے تعلق سے تحریک آزادی کے اہم لیکن مستور و مخفی گوشوں سے روشناس کرایا ہے، برصغیر کی تاریخ آزادی میں ان اہم مراجع کی بازیافت اور از سر نو اشاعت کے لئے ان کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں اشفاق اللہ خاں شہید کے خاندان، ابتدائی سوانح کاکوری کیس، اسیری، مقدمہ، سزا اور تختہ دار پر سرفراز ہونے تک کی داستان ہے، اس کے علاوہ ان کے سیاسی خیالات، ادبی و شعری اکتسابات اور ان کی تنظیم ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کا مکمل تعارف بھی ہے، اشفاق اللہ خاں نے جیل میں اپنی داستان حیات قلم بند کی تھی، ان کی زندگی کی طرح یہ داستان گرچہ نامکمل رہی لیکن حسن و صداقت اور جوش و اثر کے لحاظ سے یہ کئی ضخیم خودنوشت سرگزشتوں سے زیادہ طاقت ور ہے، یہ بھی اس کتاب میں شامل ہے، ان کے بعض خطوط اور اشعار کے علاوہ کاکوری کیس کے دوران اس زمانہ کے اخباروں ہمدرد، ہمدم اور عصر جدید وغیرہ کی رودادوں کی شمولیت نے بجا طور پر اس کتاب کو اپنے موضوع پر سب سے کامل سب سے جامع اور سب سے مفید بنا دیا ہے، خاص طور پر اسیری کے آخری لمحات اور ماں اور بھائیوں کے نام خطوط میں ان کی سچی حب الوطنی کے ساتھ ان کے ایمان و عقیدہ کی اثر انگیزی غیر معمولی ہے، طویل مقدمہ میں ایک جگہ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ''کسی وطن دوست اور قوم پرور شخص سے تو اس کی توقع ہی نہ رکھنا چاہئے کہ وہ مارکس کا فلسفہ حیات یا لینن کا نظریہ عمل اختیار کرلے گا، وہ اپنے وطن، عوام اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے ملک کے مخصوص نظریات کو کیوں اختیار کرنے لگا؟'' یہ محل نظر ہے اور اس کا غیر منطقی ہونا ظاہر ہے، اس بہترین کتاب کی طباعت و اشاعت کے لیے ہمیشہ کی طرح خدا بخش لائبریری مستحق تبریک و تحسین ہے۔

"ع۔ص"

## دار المصنفین کا سلسلہ ادب و تنقید

| کتاب | مصنف | Pages | Rs |
|---|---|---|---|
| ۱۔ شعر العجم اول (جدید محقق ایڈیشن) | علامہ شبلی نعمانی | 248 | 85/- |
| ۲۔ شعر العجم دوم | علامہ شبلی نعمانی | 214 | 65/- |
| ۳۔ شعر العجم سوم | علامہ شبلی نعمانی | 192 | 35/- |
| ۴۔ شعر العجم چہارم | علامہ شبلی نعمانی | 290 | 45/- |
| ۵۔ شعر العجم پنجم | علامہ شبلی نعمانی | 206 | 38/- |
| ۶۔ کلیات شبلی (اردو) | علامہ شبلی نعمانی | 124 | 25/- |
| ۷۔ شعر الہند اول | علامہ شبلی نعمانی | 496 | 80/- |
| ۸۔ شعر الہند دوم | علامہ شبلی نعمانی | 462 | 75/- |
| ۹۔ گل رعنا | مولانا سید عبد الحئی حسنیؒ | 580 | 75/- |
| ۱۰۔ انتخابات شبلی | مولانا سید سلیمان ندوی | 424 | 45/- |
| ۱۱۔ اقبال کامل | مولانا عبد السلام ندوی | 410 | 75/- |
| ۱۲۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم) | سید صباح الدین عبد الرحمن | 402 | 50/- |
| ۱۳۔ صاحب المثنوی | قاضی تلمذ حسین | 530 | 65/- |
| ۱۴۔ نقوش سلیمانی | مولانا سید سلیمان ندوی | 480 | 75/- |
| ۱۵۔ خیام | مولانا سید سلیمان ندوی | 528 | 90/- |
| ۱۶۔ اردو غزل | پروفیسر یوسف حسین خاں | 762 | 120/- |
| ۱۷۔ اردو زبان کی تمدنی تاریخ | عبد الرزاق قریشی | 266 | 40/- |
| ۱۸۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام | عبد الرزاق قریشی | 236 | 75/- |
| ۱۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات | سید صباح الدین عبد الرحمن | 70 | 15/- |
| ۲۰۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ | سید صباح الدین عبد الرحمن | 358 | 70/- |
| ۲۱۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول) | خورشید نعمانی | 422 | 140/- |
| ۲۲۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم) | خورشید نعمانی | 320 | 110/- |
| ۲۳۔ موازنہ انیس و دبیر | علامہ شبلی نعمانی | 312 | 95/- |